تاریخِ تمدنِ عرب
مؤلفہ
پروفیسر سید ظہیر احمد زیدی
(تلمیذ صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی اعظمی)
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پس اللہ نے تمہیں اس سے نجات عطا فرمائی

(آل عمران ۳/۱۰۳)

تاریخِ تمدنِ عرب

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اور
اس کے بعد عربوں کی حالت

مولفہ

پروفیسر سید ظہیر احمد زیدی مدظلہ العالی

(تلمیذ صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی اعظمی)

سابق استاذ سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

نام کتاب ۞ تاریخ تمدنِ عرب

مؤلفہ ۞ سید ظہیر احمد زیدی نگینوی

تصحیح و نظر ثانی ۞ مولانا حافظ محمد شاہد اقبال

مطبع ۞ ہاشم اینڈ حماد پرنٹرز، لاہور

الطبع الاوّل ۞ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ / مارچ ۲۰۰۲ء

ہدیہ ۞ -/66روپے

ناشر

فرید بُک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اُردو بازار لاہور

فون نمبر 042-7312173 ، فیکس نمبر 092-042-7224899

ای۔میل نمبر Email:info@faridbookstall.com

ویب سائٹ Visit us at : www.faridbookstall.com

فہرست مضامین

مختصر تاریخ تمدن عرب

انتساب

ولہ الحمد فی الاخرہ والاولیٰ
(اوّل و آخر تعریف اسی (خالق کائنات) کی ہے)

میں نہایت عقیدت کے ساتھ اس کتاب کا انتساب اپنے مرحوم و مغفور والدین کے نام کرتا ہوں جن کی شفقتوں، محبتوں اور دین سے محبت نے مجھے دین کی تعلیم سے آشنا کیا اور اپنے استاذ محترم صدر الشریعہ مولانا امجد علی علیہ الرحمۃ کی طرف جن کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے یہ کتاب وجود میں آئی۔ اللہ تعالیٰ میرے والدین اور جملہ اساتذہ کی مغفرت فرمائے اور ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ آمین۔

الفقیر ظہیر احمد زیدی غفرلہ
۱۵ ستمبر ۱۹۹۹ء
جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وجہ تصنیف

۱۱۹ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی سال، تاریخی مہینہ اور تاریخی ہفتہ میں، جب چاروں طرف غیر ملکی پنجہ استبداد اور جابرانہ تسلط سے ملک آزاد ہونے کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، میرا تقرر بحیثیت سنی تھیالوجی لیکچرر عبداللہ کالج مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔ اس وقت پرانا نظامِ تعلیم جاری تھا۔ ہائی اسکول کے بعد دو سال میں ایف۔اے اور ایف۔اے کے بعد دو سال میں بی۔اے کی ڈگری ملتی تھی۔ ذاکر صاحب تشریف لائے تو اپنے سیکولر اصولوں کی پاسداری کے لیے مسلمان طلبہ کے لیے تھیالوجی مضمون لازمی نہ رکھ کر اس طرح اختیاری بنا دیا کہ وہ مسلم طلبہ کے لیے مساوی ہو جائے۔ ترمیم یہ کی گئی کہ مسلم طلبہ ہوں یا غیر مسلم دونوں میں ہر ایک کو یا تو تھیالوجی پڑھنا ہوگا یا ہسٹری آف سویلائزیشن، نتیجہ بہرحال وہی تھا جو سابق میں تھا۔

غالباً ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ء سیشن میں کچھ غیر مسلم طالبات نے کالج میں داخلہ لیا ان کے لیے بھی فرسٹ ایئر میں ہسٹری آف عرب سویلائزیشن یا تھیالوجی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ضروری تھا فطری طور پر انہوں نے ''ہسٹری آف عرب سویلائزیشن'' کا اختیاری مضمون چن لیا لیکن یہ مضمون پڑھانے کے لیے عبداللہ کالج

میں کوئی لیکچرر و استاذ نہ تھا اور کالج کی مالی حالت اجازت نہ دیتی تھی کہ صرف تین چار طالبات کے لیے وہ ایک استاذ کی تنخواہ کا بوجھ برداشت کرے، اس لیے کالج کمیٹی نے طے کیا کہ یہ مضمون یعنی ہسٹری آف عرب سویلائزیشن کی تعلیم و تدریس میرے ہی سپرد کی جائے اور مجھے اس کے عوض پچاس روپے ماہانہ کا اضافی الاؤنس دیا جائے۔ پرنسپل صاحبہ (جو اس وقت مسز ممتاز حیدر شیخ عبداللہ کی بیٹی) تھیں۔ انہوں نے جب یہ تجویز میرے سامنے رکھی تو میں کسی قیمت پر اس کے لیے آمادہ نہ ہوا، میرا کہنا یہ تھا کہ یہ میرا مضمون نہیں ہے نہ ہی ہمارے عربی دارالعلوم کے درس نظامیہ میں اس سے متعلق کوئی کتاب یا مضمون ہے، بس جس چیز کو میں نے پڑھا نہیں اور جس پر کوئی کتاب بھی میں نے دیکھی نہیں میں اسے طالبات کو کیا پڑھا سکتا ہوں سوائے طالبات کا وقت برباد کرنے اور انہیں گمراہ کرنے کے اور یہ کام میرے بس کا نہیں، پرنسپل صاحبہ کا فرمانا تھا کہ ”اس وقت ہمارے پاس اس مضمون کے استاذ کا انتظام نہیں ہے، ہم کوشش کریں گے کہ بہت جلد اس کا انتظام ہو جائے۔ اس وقت تک کے لیے آپ کلاسز لے لیں آپ کو منظور شدہ الاؤنس دیا جائے گا۔“ لیکن میری دیانتداری مجھے مجبور کر رہی تھی کہ جس مضمون کو میں پڑھا نہیں سکتا اس کی ذمہ داری کیوں قبول کروں۔ اسی اصرار و انکار میں پندرہ قیمتی دن گزر گئے پرنسپل کا دباؤ جاری رہا۔ آخر کار مجھے شکست قبول کرنا پڑی اور میں یہ مضمون پڑھانے پر رضامند ہو گیا۔ میں نے یہ ذمہ داری بادل ناخواستہ قبول تو کر لی لیکن میرا دن کا چین اور رات کی نیند دشوار ہو گئی۔ سوال ذمہ داری پورا کرنے کا تھا وہ کیسے ہو؟ میرے استاذ محترم ابوالعلی حضرت مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ (جو ہندوستان کے نامور اور ماہر عربی اساتذہ میں سے تھے اور اپنے زمانہ کے بے مثال فقیہ جن کی عظیم فقہی خدمات یہ ہیں کہ انہوں نے تمام فقہ حنفی کو ترتیب وار عنوانات کے ساتھ اہم اور ضروری مسائل کو اردو زبان میں منتقل کر دیا۔ وہ مجموعہ بیس حصوں پر مشتمل ہے اور کتاب کا نام بہار شریعت ہے۔ یہ مولانا سید سلیمان اشرف علیہ الرحمہ کے ہم درس تھے اور یونیورسٹی کے لیے درس نظامیہ مرتب کرنے والی کمیٹی کے ممبر بھی رہے) موصوف سختی کے ساتھ یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ ”جب تمہیں کوئی مضمون یا

کتاب پڑھانے کے لیے دی جائے تو (۱) اسے دیانت داری سے پڑھاؤ۔ (۲) اور جب پڑھاؤ تو بغیر تیاری اور بغیر جدید مطالعہ کے نہ پڑھاؤ چاہے وہ کتاب دس بار پڑھا چکے ہو، پھر بھی مطالعہ کر کے پڑھاؤ۔" یہی وجہ میرے انکار کرنے کی تھی لیکن جب دباؤ زیادہ ہوا تو مجھے قبول ہی کرنا پڑا۔

دشواریاں اور ان پر عبور

دشواریاں یہ تھیں کہ اس مضمون کی جو کتاب داخل نصاب تھی وہ ایک (۱) ایسی کتاب تھی جس کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں نے احتجاج کر کے اس کی طباعت و اشاعت ممنوع کرا دی تھی اس لیے وہ کتاب کہیں مل نہ سکتی تھی۔ کتاب کا نام غالباً "Mohammadism" اور رائٹر کا نام ہٹی تھا۔ (۲) دوسری دشواری یہ تھی کہ میں انگریزی سے اس درجہ واقف نہ تھا کہ براہ راست انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر سکوں۔ انہیں سمجھنے کے لیے مجھے ایک انگریزی داں کی ضرورت تھی۔ (۳) معاون کتابیں تلاش کرنے کے لیے وقت بھی درکار تھا اور معاون کتابوں کا علم بھی ضروری تھا۔ تاہم میں نے اللہ کے بھروسے پر کمر ہمت باندھی اور اس موضوع پر تصنیفات کا علم حاصل کیا۔ ان کتابوں کو حاصل کیا، انہیں پڑھا اور جہاں سے اس موضوع پر جو کچھ ملا حاصل کیا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں گا کہ یہ نوٹس مرتب کرنے میں (جو میں اب کتابی شکل میں پیش کر رہا ہوں) ہزاروں صفحات پڑھ ڈالے اور رنگ رنگ کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو بالکل مبنی بر صداقت ہوگا میں نے ان نوٹس کو تیار کرنے میں آسمان سے تارے لانے کی کوشش کی، بہرحال بقول کسے "ہمت مرداں مدد خدا۔" میں نے ہمت کی، حوصلہ بلند رکھا، جدوجہد کی، دیانت داری سے اپنے استاذ محترم کی ہدایت پر عمل کیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے کامیابی دی۔ دیانت داری سے اس مضمون پر حاوی ہو کر پڑھایا۔ الحمدللہ تعالیٰ کہ اپنی روزی حلال کی۔

اپنے استاذ محترم کی ہدایت پر عمل کرنے سے عظیم فائدہ یہ پہنچا کہ اسی زمانہ کے

ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے اساتذہ میری محنت اور لگن سے بے حد متاثر تھے اور بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں اپنی کلاس کی طالبات کو مطمئن کر سکا۔ ان کی نگاہوں میں میری عزت اور قدر و منزلت بڑھی۔ تیسرے یہ کہ کالج کی پرنسپل اور مینجنگ کمیٹی کے ممبران کے علم میں میری محنت اور کامیابی آئی تو وہ بھی نہایت درجہ مطمئن اور خوش خیال نظر آئے اور سب سے بڑی (۴) برکت یہ کہ اس موضوع پر میری یہ مختصر کتاب ہو گئی۔

یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہو جاتی مگر ہوا یہ کہ میں نے بڑی محنت اور کدو کاوش اور تلاش معدوم کی جدوجہد سے اس کتاب کے دو حصے تو لکھ لیے: (ا) عرب تمدن اسلام سے پہلے، (۲) عرب تمدن ظہور اسلام کے بعد۔ چونکہ ان کو لکھنے کے لیے مجھے بہت سی کتابوں اور مواد کی ضرورت تھی لیکن اسی کتاب کا دوسرا حصہ قطعاً میری معلومات اور حافظہ میں تھا۔ مجھے قطعاً خود پر اعتماد تھا کہ بفضل خدا میں اس حصہ کو ارتجالاً ایک یا دو نشستوں میں لکھ ڈالوں گا۔ اسی درمیان میں یہ انقلاب آگیا کہ مجھے کسی مصلحت سے کالج سے ہٹا دیا گیا اور میری جگہ کسی...... مسماۃ کا تقرر کر دیا گیا جو اس جگہ کے لیے کوالیفائڈ بھی نہ تھیں، بہرحال مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، محترم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو اس وقت وائس چانسلر تھے، انہوں نے اپنی توجہ خاص سے انٹرویو میں مجھے سٹی ہائی اسکول کے لیے منتخب کر کے تسلی کے ان الفاظ کے ساتھ مجھے اسکول بھیج دیا کہ "جب ڈیپارٹمنٹ میں جگہ نکلے گی میں آپ کو ڈیپارٹمنٹ میں جگہ دوں گا۔" ۱۹ اگست ۱۹۵۴ء سے میں نے اسکول میں کام شروع کر دیا۔ کالج سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اب یہ مضمون پڑھانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ رہی۔ ع

"آں قدح بہ شکست و آں ساقی نہ ماند"

وہ ماحول نہ رہا وہ ضرورت نہ رہی تو یہ کتاب بھی یعنی اسی کا مسودہ ہزاروں کتابوں اور کاغذات کے نیچے دب گیا۔ میں اس کو مکمل کرنے کا منصوبہ ہی بناتا رہا لیکن اس پر عمل کرنے کی نوبت نہ آئی۔ لیکن "کل امر مرھون باوقاتہ" ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے، وہ اسی وقت مقررہ پر ہوتا ہے۔ ۱۹۵۲ء کا لکھا ہوا یہ مسودہ ۱۹۹۹ء میں پایہ

تکمیل کو پہنچ رہا ہے یعنی ۴۷ سال بعد جبکہ اب میری عمر کی آٹھ دہائیاں پوری ہو چکی ہیں الحمدللہ کہ میں نے اس کا دوسرا حصہ "عرب اور ظہور اسلام" اس عمر میں قطعاً ارتجالاً قلم برداشتہ لکھا ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل ہے وہ جس سے جب چاہے کام لے لے، وہ ہر شے پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ایک ضروری التماس یہ ہے:

اس سلسلہ میں، میں قارئین (پڑھنے والوں) کی توجہ اس طرف دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ کتاب بشکل کلاس نوٹس غیر مسلم طالبات کے لیے مرتب کی تھی جس میں بہت سی جگہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جہاں جہاں ایسے مقامات آئیں بجائے اعتراض کرنے کے اسی نقطہ پر نگاہ رکھیں۔ یہ ایسے لوگوں کے سمجھانے، پڑھانے اور متاثر کرنے کے لیے لکھی گئی جو داخل سلسلہ اسلام نہیں تھے اور انہیں اسلام کے بارے میں صحیح واقفیت اور تاثر دینا تھا۔ یہ مطلب نہیں کہ مسلم قارئین کے لیے یہ کتاب مفید نہیں، ضرور ہے کہ اس کا مطالعہ ان کے علم میں اضافہ کرے گا اور عقیدہ بھی پختہ کرے گا۔ اس میں انہیں بہت سی ایسی چیزیں ملیں گی جو انہیں کسی دوسری کتاب میں یکجا نہ ملیں گی کیونکہ یہ خلاصہ ہے بہت سی کتابوں کا۔ آپ سے بھی دعا کا طالب ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبولیت عطا فرمائے، مجھے اجر و ثواب عطا فرمائے اور پڑھنے والوں کو اس سے نفع پہنچائے۔ آمین، ثم آمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ ونور عرشہ سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

والسلام مع الاکرام

الفقیر الی اللہ الصمد

ظہیر احمد زیدی غفرلہ

۱۴ اگست ۱۹۹۹ء
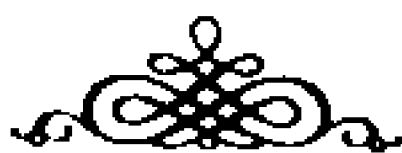
باسمہ تبارک وتعالیٰ

مقدمہ

مشہور مورخ علامہ ابن خلدون نے اپنی نہایت درجہ معتبرو مستند کتاب "تاریخ ابن خلدون" کے مقدمہ میں تحقیق فرمائی ہے کہ معاشرت انسانی کی ابتداء بدویت ہے۔ یعنی انسانی زندگی کا آغاز صحرا و دیہات میں ہوا۔ پھر زمانہ دراز اور صدیاں گزرنے کے بعد وہ مدنیت اور شہریت سے آشنا ہوا، پھر رفتہ رفتہ اسباب معیشت نے ترقی کی اور تمدن و تہذیب کی بنیاد پڑی۔ اس لیے ہم پہلے لفظ معاشرت، معیشت، تمدن اور تہذیب کی مستند تشریح بیان کریں گے، بعد میں تمدن، اس کی بنیادیں اور اس کی اقسام سے بحث کریں گے۔

۱۔ معاشرت: مل جل کر زندگی گزارنا۔ (المنجد)

۲۔ معیشت: عاش، یعیش، عیشا و معیشہ۔ (زندگی گزارنا) اسبابِ معیشت، اسبابِ زندگی۔

۳۔ تہذیب: ھذب، یھذب، تھذیبا۔ (التقیہ) رجل مھذب۔ پاکیزہ اخلاق آدمی۔ (مختار الصحاح)

۴۔ صاحب منجد نے جو عربی لغت کی ایک معتبر کتاب ہے تمدن کے یہ معنی لکھے ہیں:

(۱) شہریوں کے اخلاق اور ان کی طرز زندگی اختیار کرنا۔ (۲) زندگی کی آسودگی حاصل کرنا۔ (المنجد ص۰۸۷ مطبوعہ مصر) بدوی زندگی میں انسانی معاشرت، معیشت اور تہذیب نہایت درجہ سادہ تھی۔ ان کی ضرورتیں بنیادی تھیں جن کو وہ باہم مل جل کر پورا کر لیتے تھے۔ انہیں پیٹ بھر روٹی، پینے کو پانی اور سر چھپانے کے لیے جگہ کی ضرورت تھی جس کو وہ باہمی تعاون سے پورا کر لیتے تھے۔ دیہات کے لوگ بڑے جفاکش، محنتی، ہمدرد و خیر خواہ اور پاک و صاف اور نہایت درجہ پاکیزہ زندگی گزارتے تھے۔ اس لیے ان کی زندگی نہایت سادہ اور تکلفات سے ناآشنا تھی۔ چونکہ ان کی ضرورتیں بنیادی اور کم سے کم تھیں اس لیے ان میں باہم تنازعات اور فتنہ و فساد بھی برائے نام تھے۔ دھیرے دھیرے آبادی بڑھی تو لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے ایسی بستیاں بسائیں جو پُر تکلف اور مصنوعی ضرورتوں کی حامل تھیں۔ اس میں ان کا تصور تفوق و خود نمائی اور زیادہ سے زیادہ آسودگی کا حصول شامل تھا۔ اس طرح انسان آہستہ آہستہ بدوی (دیہی) زندگی سے شہری (مدنی) زندگی کی طرف منتقل ہوا۔ اس کی مصنوعی اور آسودہ زندگی کے تصور نے نئی نئی ضرورتیں پیدا کیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے نئے طریقے بھی ایجاد ہوتے گئے۔ زندگی کی آسودگیاں حاصل کرنا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا کوئی معیوب و ممنوع بات نہیں ہے لیکن خواہشات حشرات الارض کی طرح بکثرت پیدا ہونے لگیں اور انسان ان پر کنٹرول نہ کرے تو پھر غلط راستے اختیار کرنے لگتا ہے اور اپنی مصنوعی خواہشات و ضروریات ہر طرح پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ طریقہ کتنا ہی غلط اور تباہ کن کیوں نہ ہو۔ اس طرح جو تمدن وجود میں آتا ہے وہ انسانی سماج، انسانی زندگی، امن و امان، عدل و انصاف اور پُر سکون ماحول کے لیے بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ بے لگام معاشرہ اور بے قید آزاد تمدن نے دنیا کے امن و سکون کو کس طرح غارت کر دیا ہے اور دنیا سے عدل و انصاف اور قانون کی حکمرانی کس طرح معدوم

ہو گئی۔ طاقت کے گھمنڈ میں بالادست ملکوں نے دنیا کو دہشت گردی، بندوق و پستول کلچر، فتنہ و فساد ہر قسم کی لُوٹ مار اور قتل و خونریزی سے بھر دیا ہے۔ جب چاہا، جس ملک پر بمباری کر دی۔ جب چاہا جس ملک کا بائیکاٹ کر دیا۔ دوسری طرف اپنے عوام کو ہر قسم کے کام کرنے کی آزادی اور چھوٹ دے دی اور وہ جنسی محرکات پیدا کر دیئے کہ بلوغ کی حد میں داخل ہونے سے قبل ہی وہ ہر منزل سے گزر جاتے ہیں۔ اسلام ایسے تمدن کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی تعلیمات نے تو انسانی بھلائی اور خیر خواہی کا یہ ذہن بنا دیا تھا کہ ایک روایت کے مطابق جب جابر بن حیان نے ایٹم بم کی تھیوری معلوم کر لی تو اس نے یہ کہہ کر اسے دفن کر دیا کہ اگر کسی کو یہ فارمولا معلوم ہو گیا تو وہ دنیا کو تباہ کر ڈالے گا۔ اسلام ایک ایسے تمدن کو وجود میں لانا چاہتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت ہو، جس تمدن سے کسی کو نقصان نہ پہنچے، جس میں نہ دہشت گردی ہو نہ قتل و غارت گری، نہ فتنہ و فساد ہو نہ بدامنی اور نہ قانون شکنی۔ جس میں لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پیر پھیلا کر سکون اور بے خوفی سے سو سکیں اور صبح اٹھ کر نہایت پُرامن ماحول میں اپنی حلال روزی کمائیں۔ یہ کوئی محض آئیڈیل اور غیر ممکن الوجود بات نہیں بلکہ اسلام نے ایسا معاشرہ اور تمدن قائم کر کے دکھلایا ہے۔

میں ماقبل تاریخ یا ازمنہ مظلمہ کی بات نہیں کر رہا کہ جس کے ثبوت کے لیے تاریخی شہادتوں کی ضرورت ہو، میں صرف بیسویں صدی کی بات کر رہا ہوں جس میں ابھرتے ہوئے بین الاقوامی تمدن اور خود اپنے ملک کے تمدن کا مشاہدہ کرنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ موجود ہیں۔ میں بھی انہیں میں سے ہوں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان ملکوں کا تمدن کس قعرِ مذلت میں چلا گیا۔ یہ کیسا گونگا بہرا تمدن ہے جس میں نہ کوئی حق بات کہنے والا ہے نہ کوئی حق بات سننے والا ہے۔ دیکھنے والا دیکھ رہا ہے لیکن نہ اس کی زبان میں حرکت ہے نہ قلم میں، دل کا حال اللہ جانے۔ فحاشی و بے حیائی کا یہ حال ہے کہ دنیا ایک قحبہ خانہ معلوم ہوتی ہے۔ کچھ ملکوں نے ہم جنسی کے جواز کا قانون بنا دیا ہے۔ اب کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں، سزائیں صرف غریبوں، کمزوروں اور بے سہارا لوگوں کے لیے ہیں، وہ بھی برسہا برس میں فیصلہ ہو پاتا ہے اور

طاقتور اور بڑے بڑے بے ایمانوں کے لیے کوئی سزا نہیں۔ بدامنی کا دور دورہ ہے، روز روشن میں بلاخوف لوٹ مار ہو رہی ہے۔ یہاں ہی نہیں، میں بین الاقوامی دنیا کی بات بھی کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دنیا میں قانون و سزا کی حکمرانی ختم ہو چکی ہے۔ مساوات کے نام پر بڑے چھوٹے کا احترام و شفقت ختم ہو چکا ہے، جمہوریت کے نام پر ہر ظلم روا ہے، اس کے ذریعہ چند گروہ بند جرائم پیشہ افراد کی پاسداری اور ان کی حکمرانی، شخصی آزادی کے پردہ میں ظلم و ستم کی فراوانی اور دوسروں کے دین و مذہب اور ذات کی تذلیل، گویا دنیا کیا ہے "ابلیسی شراروں کی آتش بے کراں۔" یہ ہے آج کے تمدن کی ایک ہلکی سی نامکمل تصویر۔ گہرائیوں میں جاؤ تو تصویر اتنی بھیانک ہے کہ زبان و قلم شرم سے پانی پانی ہو جائے لیکن اسلام کسی حالت میں ایسے گھناؤنے تمدن کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام ایسے تمدن اور ایسی معاشرت اور ایسی معیشت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو خدا بیزار و خدا ناشناس نہ ہو، جس میں اللہ کی توحید کامل و خالص اور اس سے خوف ہو، جس میں اس کے رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی اتباع، قرآن پاک کی اطاعت اور قیامت و آخرت کی زندگی کا یقین کامل ہو۔ اسلام میں صحیح تمدن کی بنیادیں یہ ہیں: عدل و انصاف، اخوۃ و مساوات، صداقت، امانت اور دیانت داری، حسن معاملہ، خوف خدا اور انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور ایک دوسرے کے ساتھ گناہ و ظلم و تعدی سے اجتناب وغیرہ۔ قرآن کریم کا اعلان ہے:

ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم۔

بلاشبہ یہ قرآن ایسے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو نہایت سیدھا راستہ ہے۔ (جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے)

قرآن فرماتا ہے:

تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان۔

تقویٰ اور بھلائی کے کاموں پر باہم مدد کرو اور ظلم و تعدی اور گناہوں کے کاموں پر آپس میں مدد نہ کرو۔

حدیث شریف میں ہے:

اللہ فی عون عبدہ ما کان العبد فی عون اخیہ۔ — اللہ اپنے بندہ کی مدد فرماتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے۔

(مشکوۃ شریف)

قرآن عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور ظلم و تعدی سے ہر حال میں روکتا ہے۔ فرماتا ہے:

ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ — ہرگز تمہیں کسی قوم کے ساتھ عداوت اور دشمنی اس پر ظلم و تعدی کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف کرو انصاف، کیونکہ عدل و انصاف ہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اسلامی تمدن کی بنیاد اخوت و مساوات پر ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ — تم اس کے کرم و نعمت سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

حدیث شریف میں ہے:

کل مومن اخوہ۔ — تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ — اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا اور تمہیں برادری اور قبیلوں میں منقسم فرما دیا تاکہ تمہاری معرفت اور پہچان ہو جائے (لیکن) تم میں سے اکرم و اشرف وہی ہے جو تقویٰ والا ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا وان دماء کم واموالکم و اعراضکم حرام علیکم — خوب سمجھ لو کہ تمہارا خون (یعنی تمہاری جان) تمہارا مال اور تمہاری عزت و

کحرمہ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا۔

آبرو قیامت تک تمہارے آپس میں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہے جیسے یہ دن، مہینہ اور یہ شہر محترم ہے یعنی تم لوگ ایک دوسرے کے جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت و احترام کے ذمہ دار ہو۔

دوسری طرف آپ نے مصنوعی ضرورتوں کی بندش کی تاکہ نفس قابو سے باہر نہ ہو جائے اور بے حساب خواہشات نہ پیدا ہوں اور وہ فتنہ و فساد اور غیر شرعی و غیر انسانی طریقہ اور لوٹ مار کا سبب نہ بن جائے۔ آپ نے تمدن کے ایسے تمام راستے مسدود کر دیئے جو بنی نوع انسان کی زندگی یا اس کے مفاد عامہ یا خاصہ کے لیے نقصان دہ ہوں۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ صراط مستقیم کی طرف رہنما ہے، آج تک کوئی اس کے اس دعویٰ کو چیلنج نہ کر سکا۔ قرآن میں ایک حکم، ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے جو بنی نوع انسان یا اس کے تمدن و معاشرت اور معیشت کے لیے تباہ کن یا نقصان دہ ہو۔ قرآن کریم کا یہ دعویٰ آج بھی قائم ہے اور وہ اپنی اس خصوصیت میں آج بھی منفرد ہے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام جن پر قرآن نازل ہوا وہ قرآنی تمدن و معاشرہ کو عملاً قائم کرنے والے ہیں اور اپنے اخلاق و عمل سے اعلیٰ قدروں کے ساتھ عظیم انقلاب پیدا کرنے والے ہیں، آپ کا اسوۂ حسنہ پوری نوع انسانی کے لیے بہترین نمونہ عمل اور راہنما ہے۔ آپ خلق عظیم کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ آپ کے اخلاق میں، گفتار میں، کردار میں، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی ایسی نہیں ہے جو انسان کے وجود، اس کی بقا یا اس کے صالح ارتقاء کے لیے کسی حیثیت سے بھی مضرت رساں ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اس کو صحیح تمدن اور صحیح ارتقاء کی راہ پر گامزن کیا، اس کو عظمت و بلندی سے ہمکنار کیا اور اس کو ذلت و پستی کے غاروں سے نکال کر آسمانِ عزت و شرافت پر پہنچایا۔

بلاشبہ آپ کی تعلیمات نے ایک ایسا فلاحی، انسانیت نواز، خدا آشنا اور بے داغ تمدن پیدا کیا جو اس سے پہلے نہ کبھی دنیا نے دیکھا تھا نہ سنا۔ آپ کا یہ انقلاب صرف

عربوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کے دور رس اثرات ساری دنیا میں پھیل گئے۔ مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ آپ نے جو تمدن قائم کیا وہ نہایت مضبوط و مستحکم اور نہ مٹنے والا تھا۔ (موسیو لیبان تمدن عرب)

دنیا میں جب بھی اور جو بھی انقلاب آئے وہ بڑی محدود نوعیت کے تھے اور وہ بھی ایک محدود علاقہ اور ایک محدود قوم میں اگر کوئی حکومت بدل گئی تو اس کو بھی انقلاب کا نام دیا گیا، اگر حکمران بدل گیا تو اسے بھی انقلاب کہا گیا۔ اگر حکومت نے اپنا قانون بدل دیا تو یہ بھی انقلاب کہلایا، اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم پر غالب آگئی خواہ اس نے کتنی ہی خونریزی اور قتل و غارت گری کی ہو، وہ بھی انقلاب کے نام سے پکارا گیا۔ اسی طرح اگر کسی حکمران نے ملکی انتظام کو کچھ بہتر بنا دیا۔ اپنی سرحدیں بڑھالیں یا کسی نوعیت کی کوئی معمولی سی تبدیلی کر دی تو اسے بھی انقلاب کا نام دیا گیا۔ لیکن آپ نے جو انقلاب پیدا فرمایا وہ ہمہ جہتی تھا اور ہر قوم، ہر ملک، ہر علاقہ اور ساری دنیا کے لیے تھا اور دنیا نے دیکھا کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد نے اس سے فیض حاصل کیا۔

آپ کی اصلاح کے دو پہلو تھے: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ درحقیقت اگر اصلاح معاشرہ اور صالح انقلاب میں انسان کا ذہن و دماغ نہ بدلے، اگر وہ اصلاحی قوانین انقلاب قبول کرنے والوں کے دل کی گہرائیوں میں نہ اترے اور وہ دل کی آواز نہ بن جائے اس وقت تک اصلاح کی تکمیل نہیں ہو سکتی نہ اس انقلاب میں استحکام اور پائیداری آتی ہے۔ محض انسان کا ظاہر بدل دینے سے صحیح معنی میں انقلاب نہیں لایا جا سکتا، ایسا انقلاب بہت جلد زائل ہو جاتا ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ایک جانب اگر انسان کے ظاہر کی اصلاح کی تو دوسری طرف اس کے باطن کو اس سے زیادہ سنوارا اور نکھارا، اس کا انداز فکر و عمل ہی بدل دیا۔ اس طرح کہ وہ فلاح و بہبود اس کے دل کی آواز بن گئی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر اس سانچہ میں ڈھل گیا۔ اب اس پر عمل کرانے میں کسی جبر و زبردستی کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ ہر شخص کا ایک ضروری و لازمی نصب العین اور لائحہ عمل تھا جس کو اس نے دل کی گہرائیوں سے قبول کر لیا تھا۔ یقیناً یقیناً آپ کا لایا ہوا انقلاب کامل و اکمل تھا۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ ونور عرشہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین والحمد للہ رب العالمین۔

الفقیر ظہیر احمد زیدی غفرلہ
۱۷ ستمبر ۱۹۹۹ء

جزیرۃ العرب

جزیرۃ العرب جسے عربستان بھی کہتے ہیں تین براعظموں کے درمیان واقع ہے۔ ایشیاء افریقہ اور یورپ اس کے تین طرف سمندر ہیں مشرق میں خلیج فارس اور خلیج عمان، جنوب میں بحر عرب، مغرب میں بحر احمر اور شمال کی جانب میں یہ خشکی سے ملا ہوا ہے، مشرق کی طرف یہ ایشیاء سے ملتا ہے اور مغرب کی طرف مصر و افریقہ سے۔ عربستان کا وہ حصہ جو شمال مشرق میں ایران سے ملتا ہے عراق عرب کہلاتا ہے جس میں بصرہ، کوفہ جیسے قابل ذکر شہر آباد ہیں اور جس کا سب سے بڑا شہر بغداد ہے جو صدیوں تک علوم و معارف کا گہوارہ اور تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ عربستان کا وہ حصہ جو شام کی طرف ملتا ہے اسے شام عرب کہا جاتا ہے جو حلب تک چلا گیا ہے۔ اس جزیرہ نما کی کل لمبائی ۱۵۵۵ میل ہے اور چوڑائی زیادہ سے زیادہ ۶۴۴ میل ہے، اس ملک کے دوسرے بڑے حصے یہ ہیں جنوب مغرب میں یمن ہے جو پہاڑی نالوں وغیرہ کے ہونے سے ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ احقاف اسی کا ایک حصہ ہے جہاں کسی زمانہ میں قوم عاد آباد تھی جس کی تباہی کا ذکر قرآن پاک میں کیا گیا ہے، اس علاقے کے باشندے کچھ کاشت کار ہیں اور کچھ تجارت پیشہ، قدیم زمانہ سے ان کی تجارت مصر، ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک سے ہوتی رہی ہے۔ اس کا دارالحکومت صنعاء ہے۔ اسی شہر میں ایسی عالیشان مساجد تھیں جو تعمیر اسلام کی مشہور ترین عمارتوں کی یاد دلاتی ہیں۔ صنعاء

سے تیرہ میل مشرق کی طرف شہر مآرب یا سبا کا ویرانہ ہے جو زمانہ قدیم میں سبائیین کا دارالحکومت تھا مشہور مورخ ادریسی کا بیان ہے کہ ان ویرانوں میں دو قصر ہیں ایک تو سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کیا ہوا اور دوسرا سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کی پاکیزہ بیوی کا۔ اسی شہر سبا میں وہ ملکہ تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملنے کو آئی تھی جس کا ذکر قرآن شریف میں ملتا ہے اور بعض یہودی مورخوں نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ یمن کے دیگر مشہور شہروں میں مخا اور عدن بھی ہیں جو ساحل بحر قلزم (احمر) پر واقع ہیں۔ عدن بندرگاہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایک نہایت اہم مقام رہا ہے' اسی بندرگاہ سے عرب کی تجارت ہندوستان اور چین کے ساتھ وابستہ تھی اور اب اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ نہر سویز کے بعد یہی بندرگاہ ایشیا کا دروازہ ہے۔ یمن کی خاص پیداوار قہوہ ہے اور اس کی تجارت مخا کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ نجران کا علاقہ بھی یمن ہی کا ایک حصہ ہے' یہی وہ جگہ ہے جہاں کے عیسائی ایک وفد کی صورت میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

نجد

سطح سمندر سے تین چار ہزار فٹ بلندی پر ہے اور عرب کا وسطی حصہ ہے جو ایک سرسبز میدان ہے۔ یمامہ اس کے جنوب میں واقع ہے۔ مشرق میں عمان ہے جس کا دارالحکومت مسقط ہے اور اس کے شمال میں خلیج فارس سے ملتا ہوا بحرین کا علاقہ ہے۔

حجاز

اس کے دو حصے ہیں۔ حجاز شمالی اور حجاز جنوبی موجودہ وقت میں اگرچہ حجاز جنوبی کو ہی حجاز کہا جاتا ہے جو کہ بحر احمر کے کنارے کنارے جزیرہ نمائے سینا تک کا علاقہ ہے لیکن اس سے قبل حجاز کا علاقہ حجاز شمالی کو بھی شامل تھا جو کہ فلسطین سے بحیرہ احمر تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے وسط میں جزیرہ نمائے سینا کا وہ مشہور پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی گئی' لہٰذا ہم اپنی کتاب میں حجاز کے ان دونوں حصوں

کا علیحدہ علیحدہ ذکر کریں گے۔

حجاز شمالی

یہ بالکل پہاڑی علاقہ ہے اس میں جزیرہ نمائے سینا واقع ہے، اس کی زمین پتھریلی ہے اور سمندر سے قریب آکر ریتلی ہو گئی ہے۔ اس خطہ میں نباتات شاذ و نادر ہیں، اگر کچھ ہیں بھی تو نہایت پژمردہ۔ اگرچہ یہ علاقے بالکل غیر آباد اور اجاڑ ہیں لیکن تاریخ عالم میں بے انتہا مشہور ہیں۔ یہی وہ خطہ ہے جس کا نام تورات میں ادومیہ ہے۔ یہی سرزمین اقوام عمالقہ، مدیانیہ اور نبطیہ کا مسکن تھی جن کا ذکر قرآن پاک میں جابجا کیا گیا ہے، اسی ملک کے صحراؤں میں قوم بنی اسرائیل نے مصر کی موعود زمین تک پہنچنے سے پہلے برسوں چکر کھایا جو وادی تیہ کے نام سے مشہور ہے، اسی جزیرہ نما میں سینا کا وہ مشہور پہاڑ ہے جہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم بنی اسرائیل کے لیے توریت ملی اور وہ پتھر بھی یہیں پر بتلایا جاتا ہے جس سے عصائے موسیٰ علیہ السلام نے بارہ چشمے جاری کیے تھے جن کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے اور یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں بھی ہے۔ جبل حوریب کا وہ غار جس میں ایلیا پیغمبر نے ایذا ئیل کے غضب سے جان بچائی تھی، اسی علاقہ میں ہے۔

حجاز جنوبی عربستان کے مغرب میں بحراحمر کے کنارے کنارے بشکل مستطیل حجاز کا جنوبی علاقہ ہے، صرف اسی علاقہ کو آج کل حجاز کہا جاتا ہے۔ اس میں دو بندرگاہیں ہیں: جدہ جو مکّہ کی بندرگاہ ہے اور ینبوع جو مدینہ منورہ کی بندرگاہ ہے۔ توریت میں اس علاقہ کو فاران کے نام سے پکارا گیا ہے، اس علاقہ کی شہرت و عظمت کی وجہ صرف وہ دو متبرک و مقدس شہر ہیں جن کا نام مکّہ اور مدینہ ہے۔ یہاں ہر سال لاکھوں مسلمان اقصائے عالم سے حج و زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں حجاز کا پورا علاقہ نہایت خشک اور شور ہے پہاڑیاں بھی خشک ہیں صرف ایک طائف کا قصبہ ضرور سرسبز و شاداب ہے جس میں ہر قسم کے میوہ جات بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ مکّہ معظمہ میں پانی کی بہت کمی ہے، ابتدائے قرونِ اسلام میں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی بیوی زبیدہ نے رفاہ

عامہ کے پیش نظر جبل عرفات سے ایک نہر تعمیر کرائی تھی جس کے ذریعہ پینے کا پانی شہر میں آتا تھا جو بعد میں امتداد زمانہ اور بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گئی۔ اب حکومت سعودیہ نے جدید طریقوں پر واٹر ورکس کے ذریعہ شہر میں پانی کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔

مکہ معظمہ کی شہرت اور اس کی تاریخ

یہ بجائے خود ایک نہایت طویل و بسیط مضمون ہے لیکن مختصر ترین الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ مکہ معظمہ کی شہرت ارض حرم اور خانہ کعبہ کی وجہ سے ہے۔ ارض حرم وہ پاک زمین ہے جو مکہ کے اردگرد کئی میلوں میں پھیلی ہوئی ہے اسی میں منیٰ و عرفات کے وہ مشہور مقام ہیں جہاں قربانی و ارکان حج ادا کیے جاتے ہیں۔ اس پاک زمین کے اندر لڑائی و خونریزی قطعاً ممنوع و حرام ہے۔ یہ صرف ملک عرب ہی میں نہیں بلکہ ہمیشہ سے تمام دنیا میں مقام امن رہا ہے۔ اسی مکہ میں وہ متبرک مسجد ہے جس کے بیچ میں کعبہ کی عمارت ہے جو اسلامی روایات و تاریخی شہادتوں کی بناء پر دنیا کی سب سے قدیم ترین عمارت ہے، زیادہ صاف الفاظ میں وہ دنیا کی سب سے پہلی عمارت ہے بعض غیر مسلم مورخین کا خیال ہے کہ کعبہ کی عمارت کو سب سے پہلے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا حالانکہ اس کی بنیاد دنیا کے اس پہلے انسان نے رکھی جن کو آدم علیہ السلام کہا جاتا ہے، بعد میں وہ طوفان نوح کی نذر ہو گئی اور اس کی تجدید سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمائی۔ اسی طرح مکّہ معظمہ بھی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے ہی آباد کیا تھا جیسا کہ معتبر اسلامی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر تشریف لانے کے بعد ان کی ملاقات حضرت حوا سے عرفات کے میدان میں ہوئی جو آج بھی مکہ معظمہ کے قریب اسی نام سے موسوم و مشہور ہے۔ اس کے بعد یہ آبادی بھی کعبہ کی طرح طوفانِ نوح سے اُجڑ گئی، پھر قرن ہائے دراز تک یہ ان قافلوں کی گزرگاہ رہی جو یمن کی جانب سے شام کی طرف جاتے تھے اور اس کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اس کو از سرنو آباد کیا، اس وقت سے یہ مستقل آباد ہے اور کعبہ کی عمارت بھی قائم ہے۔ یہ شہر اس وجہ سے اور بھی مقدس

اور باعظمت سمجھا جاتا ہے کہ یہاں پر ہی ختم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک ہوئی جو تمام عالم کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے۔

مدینہ منورہ کی عظمت

اسی حجاز کے ملک میں ایک مشہور شہر مدینہ ہے جو مدت ہائے دراز تک اسلام کا دارالخلافہ رہا ہے اس کا پرانا نام یثرب ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے یہاں ہجرت فرمائی تو اس کا نام تبدیل ہو کر مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) (نبی کا شہر) ہو گیا۔ بعض قرائن تاریخی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر سولہ سو سال قبل مسیح آباد ہوا۔ پہلے اس میں عمالیق آباد تھے پھر اوس و خزرج نے اسے اپنا مسکن بنایا جو ایک قحطانی قبیلہ کی دو شاخیں تھیں اور پھر یہود نے یہاں آ کر سکونت اختیار کی حضرت رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام اعلانِ نبوت کے تیرہ سال بعد مکہ سے ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے اور آخر حیات تک یہیں تشریف فرما رہے۔ آپ کا روضۂ اقدس اسی خاک پاک میں ہے یہ مکہ معظمہ سے دو سو ستر میل کے فاصلہ پر ہے موجودہ حکومت سعودیہ نے اس کو ایک پختہ سڑک کے ذریعہ سے مکہ معظمہ اور جدہ سے ملا دیا ہے لیکن یہ مکہ معظمہ کی طرح بالکل خشک نہیں، یہاں زراعت بھی ہوتی ہے اور سردی بھی مقابلتاً پڑتی ہے۔ مسجد نبوی کی مقدس ترین عمارت اسی شہر میں ہے۔ حجاج اسلام اور جمیع مسلمانان عالم کی صحیح حسن عقیدت کی وجہ سے مدینہ ایک نہایت بارونق شہر بن گیا ہے، مکانات اکثر دو منزلہ، شاہراہیں وسیع ہیں موجودہ حکومت کی منصوبہ بندی شہر کو اور بھی خوبصورت بنا رہی ہے۔ لاکھوں روپے کی لاگت سے موجودہ حکومت نے مسجد نبوی میں توسیع کی ہے اور اس کے قرب و جوار کو نہایت صاف ستھرا بنا دیا ہے۔ باستثناء مسجد نبوی مدینہ پاک کی اور کوئی عمارت اتنی قدیم نہیں جو قابل ذکر ہو لیکن صرف اسی حرم محترم اور سردار انبیاء علیہ السلام کے آخری آرام گاہ ہونے کی وجہ سے مدینہ پاک تمام اہل اسلام کے لیے اپنے تقدس میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بے شمار اچھے اچھے خوبصورت نام ہیں۔

مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ حجاز کے دیگر قابل ذکر مقامات میں سے حجر کا وہ پہاڑی

علاقہ ہے جہاں کسی زمانہ میں قوم ثمود آباد تھی جس کو قرآن کریم نے ذی حجر کہا ہے۔ یہ مدینہ کے شمال میں ہے۔ جنگ تبوک کی مشہور مہم پر تشریف لے جاتے وقت حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا گزر اس مقام سے ہوا تھا۔ حجر کے مغرب میں مدین ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کا مسکن تھا اور جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اس کے شمال میں قدرے مغرب کی جانب سیناوہ مشہور پہاڑ ہے جس کا ذکر پیشتر کیا گیا ہے۔ مدینہ منورہ کے شمال میں مشہور مقام خیبر ہے جو عرب کے یہودیوں کا مرکز تھا جس کے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو جانے سے عرب کے یہودیوں کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

یمن، نجد اور حجاز کا ذکر کیا جا چکا ان کے علاوہ عربستان میں حضر موت، المہرہ، عمان اور الحساء ہیں حضر موت اور المہرہ وہ ملک ہیں جو یمن کی جانب مشرق سے۔ بحر ہند یعنی عرب کے کنارے کنارے عمان تک واقع ہیں۔ ان خطوں میں متعدد مختلف قبیلے آباد ہیں، اس کے بعد عمان ہے۔ اس کا ایک حصہ بحر ہند پر اور ایک حصہ خلیج فارس پر واقع ہے، یہ ایک ریگستانی علاقہ ہے جس کے بیچ جا بجا شاداب و سرسبز گھاٹیاں ہیں۔ عمان ایک علیحدہ ریاست ہے جس کا دار الحکومت مسقط ہے۔

الحساء کا علاقہ خلیج فارس کے کنارے کنارے اس مقام تک چلا گیا ہے جہاں دریائے فرات اس خلیج میں آ کر گرتا ہے۔ القطیف سے بصرہ تک ایک عظیم صحرا ہے اور اس کے بالمقابل ساحل کی جانب بحرین کا علاقہ ہے۔ نجد سے لے کر حضر موت تک اور نجران سے لے کر عمان تک عرب کا وہ صحراء اعظم ہے جس میں سے انسان کا بہ سلامت گزرنا ناممکن ہے۔ چاروں طرف ریگستانوں اور صحراؤں کی کثرت سے عربستان ہمیشہ خشکی اور گرمی اور کم خیزی میں مشہور رہا ہے اگر موسم برسات میں یہاں بارشیں نہ ہو جایا کرتیں تو عربستان شاید رہنے کے قابل بھی نہ ہوتا اور اب بھی جس خطہ میں بارش نہیں ہوتی وہاں کی آبادی یا تو منتقل ہو جاتی ہے یا پھر تباہ--- آب و ہوا یہاں کی نہایت درجہ گرم اور خشک ہے۔ خود عربستان کے اپنے ریگزاروں کی کثرت اور پھر صحراء افریقہ کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں سخت ترین گرمی ہوتی ہے اور ایک نہایت ہی

خطرناک قسم کی تیز و تند لو چلتی ہے جس کو "باد سموم" یا "باد خمسین" کہا جاتا ہے یہ سموم اور پانی کی نایابی دو چیزیں ہیں جو عربستان میں قافلوں کی تباہی کا باعث ہوتی رہتی ہیں۔ عربستان کے اندرونی حصوں میں گرمی ہمیشہ زیادہ رہتی ہے صحراؤں اور ان کے قرب و جوار کے علاقوں میں دن کو درجہ حرارت ایک سو نوڈگری سے کچھ زیادہ اور رات کو سو ہوتا ہے لیکن یہ گرمی عرب کے ہر خطہ میں نہیں پڑتی بلکہ حجاز وغیرہ میں ہوتی ہے۔ نجد اور یمن چونکہ شاداب خطے ہیں، اس لیے وہاں کی آب و ہوا بھی خوشگوار ہے۔

پیداوار

عربستان کی مشہور پیداواروں میں کھجور اور قہوہ ہے۔ کھجور تو باشندگان ملک کی بہت بڑی غذا ہے اور قہوہ تجارتی پیداوار ہے اور مال و دولت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے لیکن عرب میں آج کل قہوہ بھی بکثرت استعمال کیا جاتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بعض مخصوص پیداوار ہوتی ہیں۔ مثلاً لوبان، تیج پات، سنا، صمغ عربی وغیرہ۔ جن کی تجارت قدیم زمانہ سے عربستان کے ساتھ ہوتی آئی ہے۔ چونکہ اسی ملک کے مختلف خطوں کی آب و ہوا مختلف ہے اس لیے ان خطوں میں پیداوار بھی مختلف ہوتی ہے اور ان میں گرم و معتدل دونوں ملکوں کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً کپاس، ببول، نیشکر، انجیر وغیرہ۔ جنگلی درخت بہت کم ہیں اور ان میں زیادہ تر کھجور کا درخت عام ہے جس کی وجہ سے عربستان کے ملکوں کے سبزہ زاروں میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عربستان کے شاداب علاقوں میں تقریباً وہ کل میوہ جات اور غلے پیدا ہوتے ہیں جو دیگر شاداب ممالک یورپ وغیرہ میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً خوبانی، شفتالو، انجیر، بادام، انگور، گندم، جوار، باجرہ، سیم اور تمباکو وغیرہ۔ یمن کے خطہ میں زراعت خوب ہوتی ہے لیکن مزارعین کو محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے کیونکہ زمین کو ہمیشہ سیراب کرنے کی ضرورت ہے اور اسی لیے بارش کا پانی کنوؤں اور حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔

عربستان کے جانور

عربستان کے پالتو جانوروں میں: خچر، گدھا، بیل، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑا وغیرہ ہیں۔ جنگلی درندوں میں بہت سے جانور جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا اور تیندوا وغیرہ پائے جاتے ہیں جیسے ہمارے ملک میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں لیکن عربستان کے کل جانوروں میں صرف اونٹ اور گھوڑا نہایت مشہور اور کارآمد جانور رہے ہیں۔ ان سے کمتر درجہ میں عربی گدھا ہے جو ہمارے ملک میں پائے جانے والے خچر سے جسامت میں کچھ بہتر ہی ہوتا ہے۔ اونٹ تو گویا عربستان کا بہت ہی خاص جانور ہے، اس کے بغیر ریگستان کو طے کرنا ناممکن ہے۔ اہلِ عرب اس کو "ریگستانی کشتی" کہتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیتیں یہ ہیں کہ خوراک جسمانی تناسب سے بہت کم، مدتوں پانی کے بغیر زندگی گزارنا اور طویل فاصلے طے کرنا، سخت محنتی، جفاکش اور طاقتور۔ ان خصائص کے لحاظ سے کوئی دوسرا جانور باربرداری و سواری میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خوراک میں وہ ایسی چیزیں استعمال کرتا ہے جو دوسرے جانور ہرگز نہیں کھا سکتے، قرآن پاک میں بھی اس کے عجیب الخلقت ہونے اور بعض دوسرے خصائص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

عربستان کا گھوڑا تو شہرہ آفاق رہا ہے۔ اس کی تعریف دنیا کے تقریباً ہر مصنف نے کی ہے۔ عربی گھوڑا نہایت وفادار، قوی و نازک مزاج، چست و چالاک اور نہایت پھرتیلا ہوتا ہے۔ چھوٹا سر، تیز پتلیاں، پھولے ہوئے نتھنے، گردن لمبی اور اونچی، کمر تلی، پٹھا کسی، قد لمبا، دم پیچھے کو ابھری ہوئی، پیر ہرن کی طرح پتلے، نہایت سیدھا اور اعلیٰ تربیت یافتہ، جاندار طاقتور اور کم خوراک و تیز رفتار، یہ وہ امتیازی اوصاف ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام دیگر ممالک کے گھوڑوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ عرب بھی گھوڑوں کو بڑی قدر کے ساتھ پرورش کرتے تھے یہاں تک کہ ان کی نسل اور ان کا نسب بھی محفوظ رکھا جاتا تھا۔ عربی گھوڑے کی اپنے مالک کے ساتھ وفاداری، محبت اور فرمانبرداری مشہور ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف (لی بان) کا بیان ہے کہ "میں نے اکثر عربوں کو دیکھا ہے کہ گھوڑے سے اتر کر انہوں نے لگام گردن پر ڈال دی اور گھوڑے نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔"

یہ بات بجز عربی گھوڑوں کے کسی اور ملک کے گھوڑے میں نہیں سنی گئی۔ عربستان کے علاقوں میں عراق، عرب، شام اور نجد میں گھوڑا کافی مقدار میں ہوتا تھا خصوصاً نجد کے خطہ کا گھوڑا سب سے عمدہ اور قیمتی ہوتا تھا۔

عربستان کی معدنی پیداوار

خیال کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں سونا، چاندی اور جواہرات بکثرت ہیں۔ آج کل سونا نکالنے کا کام شروع ہو چکا ہے اور تیل نکالنے کا ٹھیکہ امریکہ نے لے رکھا ہے، مدت دراز کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ عربستان تیل کی پیداوار کا خاص علاقہ ہے چنانچہ اب تیل نکالا جانے لگا۔ اعداد و شمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ تیل عرب ہی کے علاقہ سے نکالا جاتا ہے۔ اس معدنی ذخیرہ نے عرب کی اقتصادی حالت میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا، اب وہاں پختہ سڑکیں بنوائی جا رہی ہیں اور ریلوے لائن بچھائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل حکومت ترکیہ عثمانیہ کے زمانہ میں دمشق سے ایک ریلوے لائن تبوک، حجر سے ہوتی ہوئی مدینہ منورہ تک جاتی تھی لیکن حکومت نجدی کے زمانہ میں وہ بند کر دی گئی تھی، اب پھر سے اسے از سر نو بنانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ سفر کرنے کے راستے پہلے معدودے چند تھے اور بعض راستے نہایت چکردار اور کثیر المسافت تھے لیکن اب جدید پختہ سڑکوں کی تعمیر سے بہتر سہولت اور آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس معدنی ذخیرے (جس کو اہلِ عرب "کالا سونا" کے نام سے پکارتے ہیں) کی فراوانی کی وجہ سے عرب کی معاشی و اقتصادی حالت میں عظیم انقلاب پیدا ہو رہا ہے لیکن اب عربستان کا مستقبل کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اس دولت کا استعمال کس طرح کرتے ہیں؟ ملکی ترقیات پر یا تعیشات اور فضولیات پر۔ ہم نے یہاں خلاف دستور عرب کا تقریباً پورا جغرافیہ بیان کر دیا، حالانکہ ہمیں صرف تمدن عرب و اسلام بیان کرنا ہے، یہ ہم نے اس لیے کیا کہ عرب کا ملک سیاسی اعتبار سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے عوام اس کے حالات سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ تعلیم یافتہ حضرات کو اس ریگزار کے حالات سے

کوئی دلچسپی نہیں رہی اور عام مسلمانان عالم بھی عرب کو کچھ اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ اس ملک میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دو ایسے متبرک مقدس اور اہم شہر ہیں جہاں سے آفتاب اسلام طلوع ہوا اور اس کی شعاعیں اقصائے عالم کو منور کرنے لگیں۔ لہٰذا اس خیال کے تحت کہ تمدن عرب و اسلام کے ساتھ ہی پڑھنے والوں کو اگر وہاں کی ملکی، جغرافیائی اور دیگر معلومات بھی حاصل ہو جائیں تو یہ ان کی علمی بصیرت میں اضافہ کا سبب ہوگا۔ بایں ہمہ چونکہ جغرافیائی حالات مثلاً آب و ہوا، پیداوار صنعت کے ساتھ تمدن کا گہرا تعلق ہے، اس لیے بھی ان امور کا بیان کرنا موضوع کے مناسب ہی نہیں ضروری تھا۔

یہ کتاب ۱۹۵۳ء میں لکھی گئی تھی اس وقت سے اب دسمبر ۱۹۹۱ء تک وہاں کے سیاسی و اقتصادی حالات کافی تبدیل ہو گئے ہیں، و دیگر ممالک کے باشندے بہ سلسلہ حصول معاش بکثرت عرب علاقوں میں جانے لگے ہیں، امریکہ و برطانیہ نے اپنی سازشوں سے پورے عرب پر اپنا سیاسی و انتظامی تسلط قائم کر لیا ہے۔ ان ملکوں کی تمام تر اقتصادیات و معاشیات پر بھی امریکہ ہی کا کنٹرول ہے، تمام خلیجی ممالک بشمول سعودی عرب امریکہ کی غلامی میں داخل ہوگئے ہیں، امریکہ کی مرضی کے خلاف اب یہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ روس کی قوت کے منتشر ہو جانے اور اس میں آزاد ریاستوں کے قیام نے روس کے بین الاقوامی دباؤ کو ختم کر دیا ہے اور امریکہ زبردست بین الاقوامی طاقت بن کر اُبھرا ہے۔ (۱۴ دسمبر ۱۹۹۱ء)
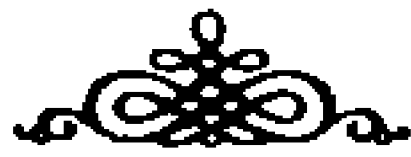
عرب کی حالت اسلام سے پہلے

مورخین کی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں

عربی تاریخ تمدن کو بیان کرنے میں عام مورخین خصوصاً مغربی مورخین نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بہت ہی مشتبہ ہے۔ ان کے بیان سے کوئی بھی صاف اور غیر مبہم طریقہ پر یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آیا وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ وسطی عرب یعنی خطہ حجاز سے متعلق ہے جو اسلام کا گہوارہ ہے یا اس کے گردو نواح یمن، عمان، حضرموت، نجد اور شام جو عرب کے سرسبز و شاداب خطے ہیں یا ان کی تاریخ تمدن ہے۔ بلاشبہ تاریخ سے ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں کی تجارتیں ہند، چین اور یورپ کے بعض ممالک سے تھیں، اسی طرح عراق عرب اور شام عرب کے وہ علاقے جو ایران و روم کے زیر اثر تھے ان میں ان ہردو قابض ممالک کے تمدنی اثرات کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے جاتے ہوں گے لیکن ان ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کا ہونا صرف اس امر پر موقوف تھا کہ یہ شاداب اور پیداوار کے علاقے تھے کیونکہ کسی ملک کے تجارتی تعلقات کا دارومدار اس کی زرعی، صنعتی اور معدنی پیداوار پر ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ پیداوار ملکی ضروریات سے زائد ہو اور یہ چیز عربستان کے ان شاداب و سرسبز علاقوں میں تو پائی جاتی ہے حجاز میں نہیں، اسی لیے عربستان سے متعلق

روم و ایران کی جتنی بھی فوج کشیاں ہوئیں وہ سب ان ہی علاقوں میں ہوئیں یا اس سے قبل شاہان قدیم نے اگر کوئی حملہ کیا ہے تو وہ بھی یمن ہی جیسے تجارتی و زرعی علاقہ پر تھا' اسی لیے تاریخ ازمنہ قدیمہ میں ہمیں ان خطوں کے بارے میں کافی حالات مل جاتے ہیں لیکن پورے عربستان میں صرف حجاز کا خطہ ہی ایک ایسا خطہ تھا جس میں پانی کی کمیابی بلکہ نایابی، ریگستان، تجارتی اشیاء کا نہ ہونا' راستوں کی دشوار گزاری اور ان سب سے بڑھ کر موسم کی ناقابل برداشت حالت کی وجہ سے نہ یہاں کسی حملہ آور کو قدم بڑھانے کی جرأت ہوئی اور نہ بیرونی تجار کو یہاں داخلہ کی ہمت ہوئی اور نہ ہی کسی سیاح کا یہاں گزر ہوا۔

البتہ ۵۷۰ء میں یمن کی جانب سے عیسائی بادشاہ کے ایک وزیر ابرہہ نامی نے مکہ پر حملہ آور ہونے کی تاریخ میں پہلی بار ہمت کی تھی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ بادسموم کے تیز و تند جھونکوں نے اسے گھیر لیا' فوج کا ایک حصہ پیاس کی شدت سے ہلاک ہوا' کچھ چیچک میں مبتلا ہو کر ختم ہو گیا اور جو مکہ کے قرب و جوار تک پہنچا وہ خدائی قہر کی بھینٹ ہو گیا۔ لہٰذا وسطی عرب یا حجاز کے تمدن کے بارے میں مغربی مورخین نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض ایک قیاسی چیز ہے کیونکہ حجاز کے بے آب و گیاہ ریگستانی علاقوں میں کسی سیاح یا بیرونی تاجر کا گزر نہیں ہوا دراصل انہوں نے عربستان کے ساحلی علاقوں جیسے یمن وغیرہ کے تمدنی حالات پر حجازی تمدن کا قیاس کیا ہے کیونکہ یمن اور نجران کے علاقوں میں عیسائی حکومت تھی جس کا تعلق بازنطینی (سلطنت مشرقی روم) حکومت سے تھا' اس کے علاوہ عربستان کے کچھ شمالی علاقے فلسطین وغیرہ عیسائی حکمرانوں کے زیر نگیں تھے۔ ان علاقوں میں تجار کی آمدورفت تھی' وہاں کا تمدن بھی سیاحوں کی نظروں سے گزرا ہو گا لیکن حجاز تک کسی کا گزر نہیں ہوا' اس لیے انہوں نے ان علاقوں کی معاشرت اور تمدن پر قیاس کر کے فیصلہ دے دیا کہ حجاز کا تمدن بھی یہی تھا حالانکہ یہ واقعہ و حقیقت کے بالکل برعکس ہے ظاہر ہے کہ عربستان کے سرسبز و شاداب علاقوں کا تمدن حجازی تمدن قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو تمدن مثلاً یمن کا ہو وہی حجاز کا بھی ہو جو کہ ایک نہایت گرم و خشک بے آب و گیاہ' غیر زرعی وغیر

صنعتی علاقہ ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ ہم ہندوستان میں ریگستانی خطوں کی رہنے والی آبادی کو دیکھتے ہیں یا آسام اور منی پور، تری پورہ کے سرحدی و دیہی قبیلے ہیں کہ ان کا تمدن قریب قریب اب بھی وہی ہے جو اب سے ہزار سال قبل تھا، حالانکہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں حتیٰ کہ اکثر صوبوں کے قصبات و دیہات کا تمدن بالکل بدل چکا ہے اور انہوں نے بہت کچھ اسلامی و یورپی تمدن کو اپنالیا ہے یہی حال ہم کو افریقہ میں نظر آتا ہے کہ وہاں ڈربن (جنوبی افریقہ کی بندرگاہ) اور طرابلس الغرب (شمالی افریقہ کا ساحلی شہر) اور ان کے علاوہ جنوبی و شمالی افریقہ کے دیگر ساحلی شہروں کا تمدن بہت کچھ بدل چکا ہے مگر وسطی افریقہ کے وہ بدوی قبائل جو ان ریگستانی علاقوں میں رہتے ہیں جہاں انسان کا گزر مشکل سے ہوتا ہے، ان کا تمدن اب بھی وہی ہے جو اب سے ہزار سال قبل تھا ہم ان کی موجودہ حالت دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے آباء و اجداد کی کیا حالت تھی؟ اس تفصیل سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ صرف ایک جگہ کا تمدن دیکھ کر یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے قرب و جوار کا بھی وہی تمدن ہو گا جبکہ اس کے خلاف یقین کر لینے کے وجوہات کافی مضبوط ہوں۔

دراصل تمدن بڑھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زندگی کے مقتضیات اور حوائج و ضروریات میں اضافہ ہو، ملک کے حالات تبدیل ہوں اور زندگی کے نئے نئے تقاضے ابھریں اور ان ضروریات و مقتضیات کو مختلف الانواع طریقوں سے پورا کرنے کی جدوجہد کی جائے خواہ وہ ضرورتیں مصنوعی ہوں یا قدرتی جب تک ضروریات میں اضافہ نہ ہو، حالات تبدیل نہ ہوں، تمدن نہ بدل سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے اور اہل حجاز کو یہ چیزیں درپیش نہ تھیں، اس لیے ان کا کوئی قابلِ ذکر تمدن بھی نہ تھا۔

چونکہ اسی علاقہ (حجاز) میں تجار، سیاح اور بیرونی قبائل میں سے کسی کا بھی گزر نہیں ہوا اس لیے یہاں کی تاریخ تمدن کے متعلق ہمیں بیرونی مورخین کا بیان پوری احتیاط کے ساتھ دیکھنا ہو گا، البتہ یہاں کے حالات معلوم ہونے کا اگر کوئی معتبر ترین ذریعہ ہے تو وہ صرف مکہ کی قدیم آبادی کا بیان یا وہ لوگ جنہوں نے اہلِ مکہ کی زبانی ان کی وہ قدیم تاریخ سنی جو درا ثتاً سینہ بہ سینہ ان کے دلوں میں محفوظ چلی آتی تھی اس لیے

ہم حجاز کی قدیم تمدنی تاریخی حالات کے بیان میں صرف مذکورہ بالا دو ذریعوں سے مدد لیں گے اور اگر ضرورت پڑی تو بیرونی مورخین سے پوری احتیاط کے ساتھ ایسی چیزیں اخذ کریں گے جو دوسرے ذرائع سے دستیاب نہ ہو سکیں گی۔ اس خطہ کے صحیح حالات کی تحقیق کرنے کا ہمارے خیال میں ایک مناسب طریقہ یہی ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں۔

حجاز میں دو قسم کے لوگ آباد تھے اہلِ وبر اور اہلِ مدر یعنی ان کا ایک طبقہ وہ تھا جو خانہ بدوش زندگی گزارتا تھا وہ پورا ایک گروہ کی شکل میں ہوتا تھا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا تھا اس خشک و بے آب و گیاہ علاقہ میں اسے جہاں کہیں جانوروں کے لیے چارہ اور پینے کے لیے پانی ملتا، وہیں وہ اپنے ڈیرے ڈال دیتا اور جب پانی ختم ہو جاتا تو پھر کسی دوسری جگہ پڑاؤ ڈال دیتا جہاں سے اسے پانی میسر آ سکتا ایسے لوگوں کو بدوی یا اہلِ وبر کہا جاتا تھا۔ دوسری قسم کا وہ طبقہ تھا جو مکانات بنا کر آبادی میں ہی رہتا تھا اور جملہ ضروریات تبادلہ و تجارتی ذرائع سے پوری کرتا تھا، اس کو مستوطنین اور اہلِ مدر کہا جاتا تھا، حجاز میں صرف یہی دو قسم کی آبادی تھی۔

بدوی قبائل کے بارے میں تو عام مورخین خواہ وہ مغربی ہوں یا مشرقی یا خود اہل عرب اس امر پر متفق ہیں کہ وہ نہایت جہالت اور نیم وحشی حالت میں تھے، نہ ان میں کسی قسم کا تمدن تھا اور نہ ان کی کوئی تاریخ۔ "اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان کی حالت تین ہزار سال قبل کیا تھی؟ تو انہیں آج دیکھ لیا جائے وہ اس وقت بھی اسی حالت میں تھے جو تورات میں مذکور ہے۔" (موسیو لی بان) یہی مورخ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "بدویوں نے تمدن ملکی کو ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنی خانہ بدوش صحرائی زندگی کو ہر چیز پر ترجیح دی اور یہ ہی ان کی ایک جبلی اور موروثی خاصیت ہے۔" موسیو رینان بدویوں کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "فی الواقع یہ لوگ نیم وحشی ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ وحشی فہمیدہ اور ذہین ہیں لیکن ہزار سال میں انہوں نے ترقی انسانی کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا اور نہ ان میں کسی قسم کے تغیرات ہوئے۔" ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں اعراب جاہلیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اسی کے قریب قریب ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اعراب جاہلیت نے بجز شعرو شاعری کے اپنی کوئی تاریخ نہیں چھوڑی وہ مختلف قبائل میں منقسم تھے اور ہمیشہ سفر کی حالت میں رہتے تھے، نہ ان کا کوئی جائے قیام تھا اور نہ بود و باش کا کوئی مقام اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی روایات تھیں، قرنہائے دراز سے وہ نیم وحشیانہ حالت میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی کوئی یادگار باقی نہیں، ہمیں ان کے بارے میں اگر کچھ معلوم ہے بھی تو وہ ان کے ازمنہ مظلمہ میں شمار ہوتا ہے۔ موسیو رینان جو انیسویں صدی کا ایک ممتاز فرانسیسی مورخ ہے اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "اسی عجیب واقعہ (یعنی ظہور اسلام) تک جس نے دفعتاً قوم عرب کو ملک گیر و فاتح ربع مسکون اور اخلاق مضامین کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا، عربستان کا کوئی حصہ نہ دنیا کی تاریخ تمدن میں تھا نہ تاریخ علمی اور نہ تاریخ مذہبی میں۔"

بعض مورخین عربوں کے تمدن کو ان کی اعلیٰ زبان و ادب کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ موسیو لی بان اپنی تصنیف "تمدن عرب" میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "ایک اعلیٰ زبان اور اس میں تصنیفات دفعتاً پیدا نہیں ہو سکتیں اور ان کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ قوم نے ایک زمانہ دراز طے کیا۔" موسیو لی بان کے اس بیان سے ہماری تحقیق کو تقویت پہنچتی ہے کہ اکثر مغربی مورخین نے تمدن حجاز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض خارجی قیامت پر مبنی ہے جب انہیں حجازی تمدن کی کوئی تاریخ نہ ملی اور وہ خود بھی وہاں تک پہنچ کر ان کے حالات تمدن کا بچشم خود مشاہدہ نہ کر سکے تو وہ ان کی شاعری زور خطابت اور قدرت کلام کا مطالعہ کر کے یہ ثابت کرنے میں کوشاں ہوئے کہ ضرور ہی ان میں کسی اچھی قسم کا تمدن موجود تھا، دلائل کا یہ طریقہ جس قدر کمزور اور لچر ہے اتنا ہی حقیقت سے کوسوں دور، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اہلِ عرب گو فن تحریر سے قطعاً ناواقف نہ تھے پھر بھی تحریر کا رواج ان کے اندر شاذ و نادر ہی تھا حتیٰ کہ ان کے اشعار تک لکھے نہ جاتے تھے اور جاہلیت کے کل اشعار سوائے "سبع معلقات" کے جن کو لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کیا گیا تھا، زبانی ہی روایت ہوتے چلے آتے تھے لیکن شعر گوئی کو کبھی کسی نے معیار تمدن و تہذیب قرار نہیں دیا تھا بلکہ ہر سوسائٹی کی

ابتدائی حالت میں شعر کے ساتھ لوگوں کی ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جیسا کہ جرجی زیدان جو مصر کا مشہور و نامور ادیب اور عیسائی مورخ ہے اپنی تصنیف "علوم العرب" میں لکھتا ہے: "ہر قوم کے حالات اور تاریخ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ترقی سے قبل ان کے اندر شاعری کا رواج ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ ان کی عقل میں روشنی پیدا ہو اور وہ علم سے دلچسپی لیں' ان کی طبیعتوں میں ایک جوش و ولولہ اور تحریک پیدا ہوتی ہے جو شاعری کی اصل محرک ہے' یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کا پہلا ذخیرہ شاعرانہ خیالات ہوتے ہیں جن میں اس قوم کی ادبی' اخلاقی اور بہادری کی سچی تصویر ملتی ہے۔"

اس کی وجہ ہمارے خیال میں یہ بھی ہے کہ اس قوم کے لیے دلچسپی کے اس وقت وہ دوسرے سامان موجود نہیں ہوتے جو تہذیب و تمدن سے پیدا ہوتے ہیں باایں ہمہ اشعار میں زبان کی خوبصورتی ہر زمانہ میں مل سکتی ہے مگر خیالات کی وسعت' پاکیزگی اور ہمہ گیری تہذیب سے پیدا ہوتی ہے اور اعراب جاہلیت کے اشعار خیالات کی وسعت کے زیور سے معرا ہیں' ان کی شاعری میں بجز فحش گوئی' لغو بیانی یا قبائل کی باہمی جنگ و جدال' حرب و قتل کے اور کچھ نہیں ملتا اور ظاہر ہے کہ فحش گوئی تمدن کی کوئی قسم نہیں کہ اعراب جاہلیت کو متمدن قوم کہا جا سکے۔

اس تمام تشریح و تفصیل اور تحقیق و تدقیق کا مقصد مورخین کی غلط بیانیوں کو واضح کرنا ہے' بعض مورخین نے بڑی ہوشیاری سے اعراب جاہلیت میں بہترین قسم کا تمدن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو کسی قدر کم کر سکیں یعنی ان کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کی حالت سنورنے اور ان کو اعلیٰ درجہ کی قوم بنانے میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے کمالات کو کچھ زیادہ دخل نہیں' بلکہ قوم عرب تمدن کے اس درجہ پر رفتہ رفتہ ترقی کر کے پہنچ چکی تھی کہ اگر اس وقت حضور علیہ السلام عربوں میں تشریف نہ بھی لاتے تب بھی وہ اسی قدر ترقی کر جاتے جیسی کہ انہوں نے آپ کی موجودگی میں آپ کی کوششوں سے کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و اہمیت کو کم کرنے کی یہ کوشش سب سے زیادہ

موسیو لی بان نے کی ہے اور بعد میں ان کے ساتھ جرمنی مستشرق مسٹر جوزف هیل اور انگریزی مورخ پروفیسر گب نے بھی کی ہے۔ امید کہ ہماری مذکورہ تفصیل و تحقیق سے قارئین پر یہ واضح ہو جائے گا ان مورخین نے زبردست غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اور دانستہ طور پر جو کچھ لکھا ہے وہ حق و صداقت کے قریب بھی نہیں۔

اگر ہم حجاز کی وہ تمام تاریخ بیان کریں جو مستند مذہبی روایات اور صحیح تاریخی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے تو یہ اس قدر طویل ہو گی کہ ہمارا اصل مقصد اس کی طوالت کی نذر ہو کر رہ جائے گا اور ہمارے قارئین ان مقاصد کو بہ آسانی حاصل نہ کر سکیں گے جو انہیں حاصل ہونا چاہئیں۔ اس لیے ہم اس وقت حجاز عرب کی صرف وہ حالت بیان کرنا چاہتے ہیں جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بعثت سے قبل کے قریبی زمانہ میں تھی۔

عرب کی اس حالت کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ تمام مورخین اس کو "زمانہ جاہلیت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور قرآن پاک نے بھی اس کو زمانہ جاہلیت ہی کہا ہے اور یہ ہے بھی ایک مسلمہ حقیقت جس میں کوئی شائبہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب وہ متمدن ممالک جن کو اپنی تہذیب و شرافت پر ناز تھا اور جن کا تمدن تمام دنیا کے لیے روشنی کا مینار خیال کیا جاتا تھا، جہالت کی تاریکی اور پستی کے عمیق ترین غاروں میں گر چکے تھے تو عرب خصوصاً حجاز کا وہ علاقہ جو پہلے ہی باقی دنیا سے ہمیشہ الگ تھلگ پڑا ہوا تھا اور جس پر بیرونی ممالک و اقوام کے تمدن کا سایہ تک نہ پڑا تھا اس کے متعلق آسانی سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس کی حالت کیا ہو گی۔ صحیح اصول معاشرت، علم اور اخلاق سب فنا ہو چکے تھے، برائیوں پر فخر کیا جاتا تھا اور علی الاعلان بر سر مجالس و مقابر ان کا ذکر نہ صرف یہ کہ معیوب نہ تھا بلکہ مستحسن خیال کیا جاتا تھا، وہ لوگ صلۂ رحمی کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ نہایت درجہ توہم پرست، ٹوٹکوں اور شگون کے معتقد، ستاروں کے پرستار۔ گوہ، بچھو، سانپ اور مردہ جانوروں کو کھانا، قحط اور خشک سالی میں اونٹوں کو زخمی کر کے ان کا خون پی لینا ان کی معمولی عادتیں تھیں، اونٹ کا گوشت تو ان کے نزدیک اعلیٰ ترین غذاؤں میں شمار ہوتا تھا۔ بات بات پر جھگڑنا قتل و خون ریزی کرنا، پشت در پشت انتقام در انتقام کا سلسلہ جاری رکھنا ان کے نزدیک ایک

معمولی بات تھی۔ قتل، رہزنی، غارتگری ان کے روزمرہ کے معمولات تھے۔ جوا، سٹہ اور قمار بازی ان کی عام تفریحات میں داخل تھیں، بدکاری ان کے نزدیک قابلِ نفرت چیز نہ تھی۔ شراب نوشی اور منشیات کا استعمال ان کی زندگی کا جزو لازم تھا۔ (تاریخ ابن خلدون)

آبادیاں قبیلوں، قبیلے گروہوں اور گروہ افراد میں بٹے ہوئے تھے، شہر ہوں یا دیہات عجیب بدنظمی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، نہ ملک و شہر کا کوئی حاکم تھا نہ نظام، ہر شخص بجائے خود آزاد خود مختار تھا۔ قبیلہ کا برائے نام ایک سردار ہوتا تھا لیکن اس کے حکم کے فیصلہ کی پابندی بھی ہر فرد اپنے لیے ضروری خیال نہ کرتا تھا، تحمل، بردباری ان میں قطعاً نہ تھی، وہ ذرا سی بات پر جھگڑ جاتے تھے حتیٰ کہ ان کی بیشتر لڑائیاں صرف اتنی سی بات پر چھڑ گئیں کہ ایک قبیلے کے آدمی نے دوسرے قبیلے کے آدمی سے پہلے اپنے گھوڑے کو پانی کیوں پلا دیا؟ ان میں سے بعض لڑائیاں پشت در پشت جاری رہیں جن سے خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے، ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاتعداد بچے یتیم ہو گئے لیکن لڑائی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا ان لوگوں کو اپنے ملک کے اس نقصان کے متعلق کچھ خیال نہ تھا، برخلاف اس کے وہ اس قتل و خون ریزی میں جس وحشت و بربریت اور سفاکیت کا مظاہرہ کرتے تھے اس کو نہایت فخر و مباہات بلکہ متکبرانہ انداز میں بیان کرتے اور اپنے قصائد میں اس کا تذکرہ کر کے سر غرور سے بلند کرتے۔

ان کی مغلوب الغضبی ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی نئی جنگ کے لیے آمادہ کرتی رہتی تھی اور مستقل جنگ بازی و جدال و قتال نے ان کو انتہا درجہ کا خونخوار و بے رحم بنا دیا تھا۔ وہ اپنی تمام نام آوری صرف تلوار بازی میں خیال کرتے تھے، گروہ در گروہ رہنے کی وجہ سے ان میں ایک حد تک جماعتی اتحاد کی جھلک ضرور پائی جاتی تھی لیکن مختلف قبائل میں بٹے ہونے اور باہمی رقابتوں اور رنجشوں نے ان کا ملکی نظم و ضبط تباہ و برباد کر رکھا تھا، ان میں کسی قسم کا تمدن نہ ہونے سے جہالت کو اس درجہ عام بنا دیا تھا کہ سردار قوم سے لے کر قبیلہ کا ادنیٰ فرد تک جاہل ہی ہوتا تھا۔ مستقل غریب الوطنی اور پانی و چارہ کی تلاش میں صحرا نوردی و بادیہ پیمائی نے ان میں وحشت و سخت ترین بدویت و دہقانیت

پیدا کر دی تھی۔ لڑکیوں سے انہیں سخت نفرت تھی، کسی شخص کے لیے اس سے زیادہ شرم و غیرت کی اور کوئی بات نہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کا باپ کہلائے، اس لیے وہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زمین میں دفن کر دیتے تھے اور یہ رسم ادا کرنے کے لیے وہ اسی طرح اہتمام کرتے اور جشن مناتے جس طرح ہمارے یہاں شادی کے موقع پر منایا جاتا ہے۔

عورتوں کی ان کے نزدیک کوئی عزت نہ تھی ایک عورت کے ساتھ کئی مرد ایک ہی وقت میں شادی کر لیتے اور اس سے جو اولاد پیدا ہوتی اس کا فیصلہ عورت کے سپرد تھا کہ وہ کس کی ہے؟ عورت جس کا نام لے دیتی اسی کی وہ اولاد قرار دی جاتی تھی۔ اسی طرح شادی بیاہ کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ ایک مرد بلا قید متعدد شادیاں کر سکتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کی بیویاں اولاد کو ترکے میں مل جاتی تھی۔ غرض یہ لوگ انتہا درجہ کے غیر متمدن تھے۔ جرمنی مستشرق مسٹر جوزف ہیل "عرب سولائزیشن" میں لکھتے ہیں: "ساتویں صدی کے آغاز تک وسطی عرب میں کسی سیاسی نظام کی شکل تک موجود نہ تھی اور اسی سے اس بات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اسلام کا ظہور ہی عرب کے اس حصہ میں ہوا جو خارجی تہذیبوں کے اثرات سے یک قلم آزاد تھا۔"

اب ہم قدرے تفصیل کے ساتھ عربوں کی ہر قسم کی حالت پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالیں گے۔
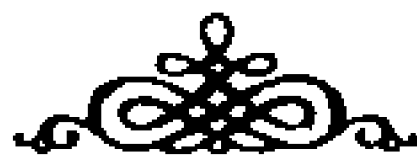
عرب کی مذہبی حالت

عرب میں مختلف مذاہب تھے۔ یہودی، نصرانی، بت پرست اور صابی یعنی ستارہ پرست۔ غرض ہر قسم کے خیالات و عقائد رکھنے والے افراد تھے لیکن ان سب میں غلبہ مشرکین یعنی بت پرستوں کا تھا اگرچہ کہیں کہیں دین حنیفی کے ماننے والے بھی تھے یعنی خدائے تعالیٰ کی وحدانیت و دین ابراہیمی پر ایمان رکھنے والے۔ مشرکین کا اگرچہ یہ دعویٰ تھا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں لیکن ان کا ہر عمل اس کے قطعاً منافی تھا۔ خدا کی پرستش کی بجائے وہ بتوں کو پوجتے تھے۔ وہ اپنی کوئی مراد اور ضرورت اللہ سے نہیں مانگتے تھے بلکہ ان کی ہر ضرورت کا ایک علیحدہ بت تھا۔ غلہ، روزی، بارش، زمین، اولاد، دولت، طاقت، عزت اور ذلت غرض ہر چیز کے لیے انہوں نے الگ الگ بت تراش رکھے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے وہ حسب ضرورت ان ہی میں سے کسی سے امداد و اعانت کے طالب ہوتے، ان بتوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف امور کی انجام دہی سپرد کر دی ہے اس لیے وہ ہر بات میں ان بتوں کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ خدا بھی انسانوں کی طرح بیوی بچوں والا ہے اس لیے فرشتوں کو بنات اللہ (خدا کی بیٹیاں) تصور کرتے تھے۔ پس ان کا ایک خدا کی ہستی کا عقیدہ رکھنا عام طور پر بے جان اور بے معنی تھا، پھر وہ نہ صرف یہ کہ بتوں کی پرستش کرتے تھے بلکہ ہوا، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش بھی ان میں شامل ہوتی تھی۔

جن کواکب (ستاروں) کی وہ پرستش کرتے تھے ان کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں بھی باہم ایسے ہی لڑائی جھگڑا شادی بیاہ ہوتا ہے جس طرح عام انسانوں میں۔ انہوں نے اپنی ہستی کو اس درجہ پست و ذلیل بنالیا تھا کہ وہ پتھروں، درختوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے بھی اپنا عزت والا سر جھکا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ناموران قوم و ملک کے نام کے بت بھی تراشے جاتے اور ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ ان کی جہالت اور پست ذہنی کا یہ عالم تھا کہ جب انہیں سفر کی حالت میں ریگستان کے اندر میلوں پتھر نہ مل سکتا تو وہ چولہے کی اینٹ لے کر اس کی پوجا کر لیتے اور اگر یہ بھی میسر نہ آتی تو اپنی غذا کے لیے رکھے ہوئے ستوؤں کی ہی مورتی بنا کر پوجا کر لیتے اور پھر جب بھوک لگتی تو اپنے اسی معبود کو کھا جاتے تھے۔ کعبہ کی عمارت میں انہوں نے تین سو ساٹھ بت نصب کر رکھے تھے۔ یعنی سال کے ہر دن کے لیے ایک جداگانہ بت تھا لیکن ان کو بھی ناکافی خیال کرتے تھے ہر قبیلہ کا اپنا اپنا بت علیحدہ تھا اور قبیلہ سے گزر کر ہر گھر میں مورتیاں رہتی تھیں۔ ان تمام بتوں کے ان کے عقیدہ میں الگ الگ مراتب تھے۔ ان میں لات، عزیٰ اور حبل سب سے بزرگ و بلند خیال کیے جاتے تھے۔ بتوں پر وہ ہر قسم کے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ دودھ، جانور یہاں تک کہ انسانی خون کا بھی چڑھاوا دیتے تھے۔ غرض بت پرستی ان کے خون میں اس درجہ رچی بسی تھی ان کی روزمرہ زندگی کے تمام کاروبار میں اس کا اثر واضح اور نمایاں تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام خاصیتیں اور صفات دوسروں کے سپرد کر دی ہیں اور ان دوسری چیزوں کو پوجنے سے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

کھیتوں کی پیداوار، باغات کی بہار، مویشیوں کی نسل اور جملہ کاروبار تجارت میں ان کا حصہ نکالا جاتا جو ان پر چڑھایا جاتا، ان کے نام پر چھوڑ دیا جاتا جیسے ہمارے ملک میں بھی بتوں کو پوجنے والے کچھ جانوروں کو اپنے بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

اعتقادات کی اسی کمزوری اور توہم پرستی نے انہیں سخت ترین ذلت و نکبت میں مبتلا کر دیا تھا اور یہ صرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ ہی تھی جس نے معجزانہ و حیرت انگیز طریقہ سے ہمیشہ سے اتنی راسخ بت پرستی کا ملک عرب سے

صرف بیس سال کی قلیل ترین مدت میں خاتمہ کر دیا، نہ صرف یہ کہ انہوں نے اس بد ترین قسم کی توہم پرستی سے نجات پائی بلکہ ان کے سینے توحید کے نور سے ایسے منور ہوئے کہ اقصائے عالم اس نور سے مستفید ہوا اور جگمگانے لگا۔ یہ تو وہاں کے بت پرستوں کا حال تھا جو لوگ ستارہ پرست تھے اور جملہ اثرات انہیں کے ذریعہ مانتے تھے ان کی حالت بھی بت پرستوں سے کچھ بہتر نہ تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لامذہب اور دہریئے تھے۔ ان کے دل میں نہ مذہب کی کوئی عزت تھی نہ عظمت و احترام، یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قطعاً منکر تھے اور جزا و سزا ان کے نزدیک انسانی واہمہ کی من گھڑت چیزیں تھیں۔ بعض مرتبہ خود بت پرست بھی اپنے بتوں کا مذاق اڑاتے اور نہایت تذلیل سے ان کے ساتھ پیش آتے۔

چنانچہ جب امراء القیس (عربی کا مشہور شاعر) کا باپ مارا گیا اور اس نے مقتول کے خون کا قصاص لینے کے لیے ایک بت کے سامنے کھڑے ہو کر فال نکالی تو ہر مرتبہ جواب نفی میں نکلا۔ امراء القیس نے جھنجلا کر تیر پھینک دیا اور بت سے کہا کہ کمبخت اگر تیرا باپ مارا جاتا تو پھر قصاص کے لیے نفی میں جواب نہ دیتا۔ یہ تھی ان کی مذہب پرستی اور یہ تھے ان کے معتقدات جس نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے، وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکتے تھے کہ جن پتھروں کو وہ خود اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں وہ کیسے معبود ہو سکتے ہیں؟ جو پتھر اپنے جسم سے مکھی تک نہیں اڑا سکتے وہ دوسروں کی حاجت روائی کیا کر سکیں گے؟ جو خود کو کسی نقصان سے نہیں بچا سکتے اور نہ خود کو نفع پہنچا سکتے ہیں؟ وہ دوسروں کو نفع و نقصان کس طرح پہنچا سکتے ہیں۔ غرض ان کی مذہبی وہم پرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنا خدا، اپنا معبود اور حاکم تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے قطعاً اپنی حیثیت کو فراموش کر دیا تھا اور وہ بھول چکے تھے کہ انسان کی ہستی دنیا کی ہر چیز سے بلند و بالاتر ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے اور دنیا کی ہر چیز اس کی خادم۔

ایک طرف اگر مشرکین اور بت پرستوں کا یہ حال تھا تو دوسری جانب یہودی اور نصرانی بھی کچھ بہتر حالت میں نہ تھے۔ ان دونوں فرقوں نے اپنے اپنے نبی کی تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا تھا اور آسمانی کتابوں میں اپنی طرف سے اپنی مرضی کے مطابق کی

بیشی کر لی تھی۔ یہودی عالم بڑی بڑی رقمیں لے کر توریت کے فیصلے امیروں کے حق میں تبدیل کر دیتے اور غریبوں کے لیے اور بھی زیادہ سخت کر دیتے تھے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے کر خدائی میں شریک کر لیا تھا جیسا کہ آج بھی اکثر عیسائی اسی عقیدے کے ہیں۔ عیسائی راہب اپنی رہبانیت کے پردہ میں اور یہودی عالم اپنی مذہبی شخصیت کی آڑ میں وہ سب کچھ کر گزرتے جس پر اخلاق و انسانیت کو شرم آئے۔ اپنی کم علمی اور ناقص معلومات کی بناء پر عیسائیوں نے یہ عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھا دیئے گئے ہیں اور ان کا سولی پر چڑھ جانا ان کی امت کے تمام گناہوں کا کفارہ بن گیا ہے، اس لیے ان کے یہاں ہر قسم کا گناہ کر لینا قابلِ گرفت و قابلِ مواخذہ نہیں۔ غرض یہ آسمانی مذاہب جو درحقیقت انسانی رہنمائی و بہبودی کے لیے تھے اپنی حقیقی صورت بالکل بدل چکے تھے اور ان کی صحیح تعلیمات قطعاً مفقود ہو چکی تھیں۔

اگر مذہبی معتقدات کی حیثیت سے عربوں کی یہ حالت تھی اور اس بدترین بت پرستی اور گمراہی نے انہیں درجہ انسانیت سے گرا دیا تھا تو باقی امور میں بھی ان کی حالت جاہلیت و وحشت میں کمتر درجہ نہ رکھتی تھی۔ تہذیب کا سب سے نمایاں اثر تمدن پر ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ تمدن کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہ تھے، دراصل تمدن پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں امن و امان ہو ہر شخص اپنی حفاظت نفس سے مطمئن ہو، اسے اپنی جان و مال کا معمولی سا خطرہ نہ ہو اور اہل و عیال کی طرف سے بے خوفی ہو جب تک یہ امور حاصل نہ ہوں گے کسی ملک میں نہ تمدن قائم ہو سکتا ہے اور نہ پھیل سکتا ہے۔ وہ قوم کیا تمدن کر سکتی ہے جس کی زندگی کا ایک لمحہ بھی سکون کے ساتھ نہ گزرتا ہو جہاں شب و روز جنگ و جدال کا بازار گرم رہے، پھر نہ ان کے قیام کا ٹھکانہ، نہ خورد و نوش کا کوئی مستقل ذریعہ۔ ان میں کثیر آبادی خانہ بدوش زندگی گزارتی جہاں مویشوں کے لیے دانہ پانی دیکھا خیمہ زن ہو گئے اور جب پانی ختم ہوا کوچ بول دیا اور کسی دوسری جگہ پڑاؤ کیا، بہت کم لوگ دیہات میں اور اس سے کم آبادی شہر میں بود و باش رکھتی تھی، ایسی آبادی میں تمدن کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ مزید یہ کہ ان

میں سب سے بڑا نقص اور کمی یہ تھی جس نے ان کو اور بھی پسماندہ بنا دیا تھا کہ ان میں اتفاق و اتحاد کا نام و نشان نہ تھا، تمام ملک میں ایک حکومت تو درکنار علاقہ وارانہ بھی کوئی قابلِ ذکر حکومت نہ تھی، چھوٹے چھوٹے علاقوں میں جو برائے نام بے شمار حکومتیں تھیں وہاں بھی کوئی خاص انتظام حق داد رسی نہ تھا، اپنا حق دوسروں سے لینے کے لیے صرف اپنی اپنی قوت بازو کام آتی، ہر ایک قبیلہ اور قوم کا ایک سردار ہوتا تھا جو صرف جنگی مواقع پر ان کی سرداری کرتا تھا۔ قومیں ملک میں اور افراد قوموں میں عموماً کسی قانونی جوئے میں اپنی گردنوں کو جکڑا ہوا خیال نہ کرتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ ان کا سردار امیر قوم بھی برائے نام ہوتا تھا۔

عرب کی معاشرت

عرب کی معاشرتی زندگی بھی سخت ترین جہالت کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی کہ ان کی معاشرت ان کے تمدن کا اور بھی سیاہ ترین پہلو ہے۔ سوسائٹی میں عورتیں نہایت پست و ذلیل خیال کی جاتی تھیں اور ان کے ساتھ بڑا ہی انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کے قصائد و منظومات میں کہیں کہیں اپنی محبوبہ کی تعریف میں اشعار ضرور ملیں گے لیکن وہ ان کے خیالات و نظریات کے ہرگز عملاً ترجمان نہیں کیونکہ پوری قوم کا انفرادی و اجتماعی سلوک اس کے بالکل برعکس تھا جس سے ہر شخص یقین کر سکتا ہے کہ اس لفظی و محض زبانی تعریف و ستائش کا مقصد فقط اپنی اغراض شہوانی کو حاصل کرنا ہو سکتا ہے ورنہ عورت کے ساتھ جو ان کا طرز عمل تھا اس کا ایک ہلکا سا پرتو یہ ہے کہ ایک عورت ایک سے زیادہ شوہروں کے پاس رہ سکتی تھی اور مرد کو یہ اختیار تھا کہ وہ جس قدر عورتوں کے ساتھ چاہے نکاح کرتا رہے اور ان کے علاوہ کئی کئی محبوبہ بھی رکھے جیسا کہ اہلِ یورپ میں متعدد محبوبہ رکھنا برا خیال نہیں کیا جاتا۔ زنا کاری کی وبا ان میں عام تھی، غلام عورتوں سے جہاں اور بد ترین سلوک کرتے وہاں ان سے حرام کاری بھی کراتے اور اس کی کمائی بھی اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

نیوگ کی رسم جو آج بھی خال خال ہندوستان میں پائی جاتی ہے اور جس پر ایک

آریہ سماجی مبلغ سوامی دیانند جی ابھی چند سال قبل بہت زور دے چکے ہیں، ان میں پوری طرح رواج یافتہ تھی اور اس کے لیے وہ "استبضاع" کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کی تشریح اہلِ لغت نے یہ کی ہے کہ "عورت اولاد حاصل کرنے کے لیے شوہر کے سوا کسی دوسرے سے تعلق پیدا کرے۔"

عورت ان کے نزدیک ایک قابلِ انتقال جائیداد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا کوئی حصہ متوفی شوہر کی جائیداد میں نہ تھا بلکہ وہ خود وراثتاً ترکہ میں تقسیم ہو جاتی، وارث چاہتا تو خود اس سے نکاح کر لیتا ورنہ دوسروں سے حسب مراد مال لے کر ان کے نکاح میں دے دیتا، یہاں تک کہ بعض اوقات متوفی باپ کی عورتوں کے ساتھ بیٹا اپنا ورثہ سمجھ کر ان کے ساتھ نکاح کر لیتا تھا اور ان بے زبانوں کو انکار کا حق بھی نہ تھا، اسی طرح طلاق دینے کا طریقہ بھی نہایت ظالمانہ تھا۔ شوہر ہزار بار بھی طلاق دے کر اپنی عورت سے رجوع کر لیتا اور وہ بدستور اس ظالم کے پنجہ میں گرفتار رہتی ان تمام بدسلوکیوں کے ساتھ عورت ایسی مظلومانہ و بے کسانہ حالت میں رہتی جس سے رستگاری کے لیے اس کے پاس علاج نہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو اپنی غیرت کے خلاف سمجھتے تھے کہ ان کی بیوی طلاق لے کر دوسرے شوہر کی آغوش میں رہے، بایں ہمہ مرد اور عورت کے تعلقات میں غایت درجہ فحش بھی تھا۔ عشق و محبت اور ناجائز تعلقات کے نہایت گندے قصے کھلے اشعار میں بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے۔ بڑے بڑے قصائد میں جو اپنی فصاحت اور بلاغت میں بے نظیر ہیں ایسے فحش اور عریاں الفاظ میں ان تعلقات کا ذکر ہے جن کو گوش ہوش برداشت نہیں کر سکتے۔ بلند باوقار خاندان کی عورتوں کو مخاطب کر کے اپنے اشعار میں اعلانیہ ان سے اظہار محبت کرتے اور ان سب سے بڑھ کر ان کی وحشیانہ حرکت یہ تھی کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے۔

پانچ چھ سال کی لڑکی کو باپ جنگل کی طرف ساتھ لے جاتا اور ایک گڑھے کے کنارے جو پہلے سے اس مقصد کے لیے تیار کر لیا جاتا تھا، اس بے گناہ و معصوم بچی کو کھڑا کر کے باپ اپنے ہاتھ سے دھکا دے کر گرا دیتا اور چیختی چلاتی ہوئی جگر گوشہ پر مٹی ڈال کر ایسی سنگدلی کا ثبوت دیتا جس کی مثال تاریخ عالم کے اوراق میں نہیں مل سکتی۔

بعض اوقات نکاح کے وقت ہی یہ شرط منوالی جاتی تھی کہ جو لڑکی پیدا ہوگی اسے مار دیا جائے گا، اس صورت میں غریب و بے کس ماں ہی سے اس کی عزیز ترین محبت کو رسم و رواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھوایا جاتا اور اس کے ہاتھوں ہی اس وحشیانہ فعل کا ارتکاب کرایا جاتا تھا اور اس کے لیے باقاعدہ ایک رسم مقرر تھی۔ قبیلہ کی سب عورتیں جمع کی جاتیں، جشن منایا جاتا اور ان سب کے سامنے ماں سے بالجبر اس ظلم کا ارتکاب کرایا جاتا تھا تاکہ دوسری عورتوں میں بھی یہ کام کرنے کی جرات پیدا ہو۔ درحقیقت نسل انسانی پر سرور کائنات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ایک احسان عظیم ہے جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ آپ نے نہایت معجزانہ طریقہ سے اس خونخوار اور وحشیانہ رسم کا خاتمہ فرما کر باپ کے دل کو بیٹی کی محبت کا گہوارہ بنا دیا اور عورت کے درجہ کو اتنی عظمت و بلندی عطا فرمائی۔ یہ جہالت و سفاکی صرف انہیں چیزوں تک محدود نہ تھی، بلکہ ان کی زندگی کے ہر گوشہ میں سمائی ہوئی تھی جس نے ان کی فطری صلاحیتوں کو بالکل ناکارہ بنا دیا تھا۔ قمار بازی ان کا فخر تھا جس طرح کہ آج تہذیب کے علمبرداروں میں قمار بازی کو باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ وہ شخص بخیل سمجھا جاتا تھا جو جوا نہ کھیلتا تھا۔ جوا کھیلنے کے بھی نت نئے طریقے ایجاد ہوتے رہتے تھے جیسا کہ جوئے باز قوموں کا خاصہ ہے۔

شراب خوری کی وبا میں وہ اس درجہ مبتلا تھے کہ کوئی گھر اس سے خالی نہ تھا۔ گھر کے جملہ افراد بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورتیں سب ایک ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے۔ دن میں کئی کئی بار دورِ جام چلتا۔ ہر گھر بجائے خود ایک شراب خانہ تھا جس میں خم کے خم موجود رہتے، اس کا اندازہ اس تاریخی روایت سے ہوتا ہے کہ جب قرآن پاک نے شراب کے حرام ہونے کا حکم دیا تو مدینہ کی گلیوں میں شراب اس طرح بہتی تھی جیسے بارش کا پانی۔ اس روایت سے جہاں ان کی شراب نوشی اور شراب کی ذخیرہ اندوزی کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) کی پاک تعلیم نے ان کے اندر اطاعت الٰہی اور فرمانبرداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر جذبہ پیدا کر دیا کہ صرف ایک اعلان پر لوگوں نے

صدیوں پرانی ورثہ میں ملی ہوئی شراب نوشی کی عادت سے کنارہ کشی کر لی اور ایسے تائب ہوئے کہ پھر اسے چھونا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

عربوں کی توہم پرستی

جہالت کا ایک بد ترین لازمہ توہم پرستی بھی ہے یہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے بد ترین وہمی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ دیوتاؤں اور ارواح خبیثہ پر یقین رکھتے تھے بعض قسم کی بیماریوں کو ارواحِ خبیثہ کی طرف منسوب کرتے اور اس کا دوسرا قبیح نتیجہ یہ تھا کہ ان سے بچنے کے لیے طرح طرح کے عجیب ٹوٹکے اور جنتر منتر استعمال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ روح انسانی ایک چھوٹا سا جانور ہے جو انسان کے پیدا ہونے کے وقت اس کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے اور جسم کی نشوونما کے ساتھ وہ بھی بڑھتا رہتا ہے، مرنے کے بعد یہی جانور جسم سے نکل کر قبر کے چاروں طرف گھومتا رہتا ہے، جس کو چاہتا ہے ستانے لگتا ہے اور جس کو چاہے آرام پہنچاتا ہے۔

خشک سالی کے موقع پر بارش ہونے کے لیے گائے پہاڑ پر چھوڑ آتے، اس جاہلانہ رسم کو ادا کر کے انہیں اطمینان ہو جاتا کہ اب بارش ضرور ہو جائے گی۔ جب کسی پر کوئی بڑی مصیبت نازل ہوتی تو اس کے لیے دروازے سے گھر میں داخل ہونا عیب تھا بلکہ گھر کی عقبی دیوار میں سوراخ کیا جاتا تاکہ آمد و رفت ہو سکے۔ جانور کے اڑنے سے نیک و بد شگون لینا بھی ان کی وہم پرستی کا ایک جزو تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ مردے کی روح الو کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑتی پھرتی ہے اور متوفی مقتول ہے تو اسقنی اسقنی (مجھے سیراب کرو، مجھے سیراب کرو) پکارتی رہتی ہے جب تک کہ مقتول کا قصاص نہ لیا جائے۔

کاہن، رمال اور جادوگر ان کے لیے بڑے ہی ذی احترام لوگ تھے ہر مشکل میں ان کے پاس جاتے ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے ان کی بتائی ہوئی خبروں کو فرمودۂ غیب تصور کرتے، غرض! اسی قسم کے بے شمار توہمات ان کے عقائد میں داخل تھے جو ایک جاہل ترین قوم کے خصائص میں سے ہیں۔

ان تمام امور سے ان کے تمدن، ان کی معاشرت، ان کے اعتقادات، اعمال، اخلاق اور اوہام باطلہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور آسانی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جو قوم ضعف اعتقاد اور وہم پرستی کی اتنی عمیق و تاریک گھاٹیوں میں پڑی ہو وہ تہذیب و تمدن کے روشن و بلند مقام کے کس درجہ میں شمار کی جاسکتی ہے۔ یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل ان کی اصلاح و درستگی کی کوششیں نہ کی گئی ہوں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے کہ ایسی کوششیں بار بار کی جاتی رہیں مگر کسی کوشش کا معتدبہ نتیجہ نہ نکل سکا، سب سے پہلے اس جاہل و وحشی قوم میں یہودیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ یہ لوگ بخت نصر کے حملہ کے زمانہ میں پانچویں صدی قبل مسیح میں عرب میں آکر آباد ہوئے۔

۴۰۰ قبل مسیح میں یمن کے ایک بادشاہ ذونواس نے ان کا مذہب اختیار کر لیا، اس زمانہ میں یہودیوں کا خاصہ غلبہ ہو گیا تھا کیونکہ ایک طرف ان کی تبلیغ اور دوسری طرف رعب شاہی عوام پر کافی اثر انداز ہوا مگر یہ اثر بھی کچھ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ عرب کی بت پرستی اور جہالت اپنی سابقہ حالت سے نہ بدل سکی۔ ۳۰۰ء میں عیسائی عرب میں داخل ہوئے، سب سے پہلے نجران میں انہوں نے سکونت اختیار کر کے تبلیغی جدوجہد شروع کی، ان کی اس تبلیغ کو دو طرف سے بڑی تقویت ملی۔ ایک حبش جہاں کا قومی مذہب اور شاہی مذہب عیسائی تھا، دوسرے شمال میں رومن ایمپائر جس کا شاہی مذہب ۳۰۰ء ہی سے عیسویت ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے کثرت کے ساتھ لوگ یہ مذہب اختیار کر چکے تھے ہر دو جانب عیسائی حکومتوں کا قائم ہونا اور پادریوں کی زبردست تبلیغی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ نجران کا پورا علاقہ عیسائی مذہب اختیار کر گیا۔

دوسری طرف قبائل حمیر، غسان، ربیعہ، تغلب وغیرہ اور حیرہ کے علاقہ میں بھی جو عراق عرب سے ملتا ہے بہت سے لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا مگر پھر بھی کوئی بڑی کامیابی عیسائیوں کو نصیب نہ ہو سکی اور وہ ان کی اصلاح میں قطعاً ناکام ثابت ہوئے، اس کی وجہ جہاں عربوں کی جہالت تھی وہاں خود عیسائیوں کی اپنی کوتاہیاں بھی تھیں جنہوں نے عیسوی مذہب کو اپنی خواہشات کے مطابق بالکل تبدیل کر دیا تھا اور حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو فراموش کر کے بالکل ایک نیا مذہب تراش لیا تھا۔ عربوں کی اصلاح کی تیسری کوشش اندرونی تھی جو دین حنیفی کہلاتی تھی، اسلام کے ظہور سے قبل ایک فرقہ پیدا ہوا جس کو دین حنیفی کا پیرو کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ بت پرستی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا اعتقاد نہ یہودیت پر تھا اور نہ نصرانیت پر بلکہ صرف خدائے واحد کے پرستار تھے اور دیگر رسم و رواج سے ان کا کچھ علاقہ نہ تھا، غرض کچھ لوگوں نے یہ مذہب بھی اختیار کر لیا مگر عرب کی سرزمین میں یہ اتنا بھی اثر نہ دکھا سکا جتنا کہ یہودیت و نصرانیت نے پیدا کیا تھا۔

بہرنوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل اہلِ عرب و حجاز کی اصلاح کے لیے متعدد بار کوششیں ہو چکی تھیں اور مذکورہ بالا تینوں مذہب اسی سلسلہ کی تین کڑیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے اپنی اپنی مساعی کر کے تھک چکے تھے، حالانکہ یہودیت و نصرانیت کے ذرائع بھی کافی وسیع و موثر تھے۔ یہودی تو اہلِ عرب کے خاص قرابت دار بھی تھے، شاہی مذہب بھی یہی تھا، زبان و عادات بھی دونوں کی بہت کچھ ملتی جلتی تھیں، دونوں قومیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عقیدت بھی رکھتی تھیں۔ جو ایسے قوی اسباب میں سے ہیں کہ کل عرب ان کا مذہب اختیار کر لیتا مگر اس کے باوجود یہودیوں کی لنگڑی توحید اور مسخ شدہ مذہب اہلِ عرب کو زیادہ متاثر نہ کر سکا۔

اس کے بعد نصرانیت اپنے پورے اثر و رسوخ کے ساتھ عرب میں داخل ہوئی، اس کی فرضی توحید عربوں کی فرضی توحید کے ساتھ بہت کچھ ملتی جلتی تھی، پھر عیسائیت میں پابندی شریعت کی کوئی قید نہ تھی جو عربوں کے آزادی پسند مزاج کے عین مطابق تھی اس لیے وہ بھی ہر قسم کی معصیت و بدکاری میں مبتلا تھے اور یوں بھی عیسائیوں نے اپنا مذہب سہل ترین بنا لیا تھا۔

مزید برآں عظیم الشان سلطنت کا اثر، شمالی عرب کا عیسائیت کو قبول کر لینا، جنوبی عرب کا اس سے متاثر ہو جانا بلکہ حیرہ اور غسانی قبائل پر بھی نصرانیت کا غلبہ ہو جانا یہ وہ تمام نہایت قوی اسباب تھے جو شاید ہی کسی دوسرے مذہب کو میسر آئے ہوں ایسی صورت میں اگر تمام ملک عرب بھی عیسائی مذہب قبول کر لیتا تو کوئی تعجب خیز امر نہ ہوتا

مگر سوائے شراب نوشی، جوئے بازی اور مرد و عورت کے عریاں فحش تعلقات کے اور کوئی خاص اثر اہل عرب پر عیسائیوں کا نہ ہو سکا۔ جب یہ دونوں عظیم مذہب اور قومی تحریکیں عربوں کو اپنی جگہ سے ہلانے میں ناکام رہیں تو پھر وہ تیسری تحریک جس کی پشت پر کوئی حکومت تھی نہ تبلیغ اور نہ جس کے لیے عرب کا ماحول ہی سازگار تھا، نہ آب و ہوا کس طرح کامیابی کی صورت دیکھ سکتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ بھی ناکام رہی جن لوگوں نے اسے قبول کیا ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

ان تمام حالات کے پیش نظر ہر انصاف پسند و دقیقہ سنج انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے یکہ و تنہا، بے یارومددگار ہستی کے پس پشت ایسی کون سی طاقت تھی کہ صرف تئیس سال کے قلیل زمانہ میں آپ نے نہ صرف یہ کہ ان کے موروثی خصائص قبیحہ اور اخلاق ذمیمہ سے ان نفوس کو پاک کیا بلکہ ان کے اعمال، کردار، افکار و اقوال اور تمدن و معاشرت میں وہ انقلاب عظیم پیدا فرمایا کہ کل کے وحشی آج کے متمدن رہنما بن گئے ایسی نظیر کسی بھی مصلح، ہادی اور رہبر کی زندگی میں نہیں ملتی۔ سر ولیم میور اپنی تصنیف "لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوانی کے ایام میں جزیرہ نمائے عرب کی حالت کسی تبدیلی یا ترقی قبول کرنے کے لائق نہ تھی، شاید اس سے پہلے کسی زمانہ میں ان لوگوں کی اصلاح سے اس قدر ناامیدی پیدا نہ ہوئی تھی جیسی آپ کے وقت میں۔"

بعض وقت جب ایک سبب کو ایک نتیجہ پیدا کرنے کیلئے ناکافی سمجھ لیا جاتا ہے تو اس کے لیے اور دوسرے وجوہات اکٹھے کر لیے جاتے ہیں مثلاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا جاتا ہے ان کا اٹھنا تھا کہ ساتھ ہی ساتھ پورا عرب ایک نئے اور روحانی ایمانی انقلاب کیلئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عرب اس وقت ایک بڑی بھاری تبدیلی کے جوش میں تھا اور اس کو قبول کرنے کیلئے بالکل تیار تھا۔[1]

ہمارے نزدیک جب ٹھنڈے دل کے ساتھ اسلام سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ اس نتیجہ کو جھٹلاتی ہے۔ پانچ صدیوں تک عیسائیوں کی لگاتار کوششوں اور

[1] یہ خیال موسیو لیبان اور بعض دیگر یورپی مورخین کا ہے۔ (مولف)

وعظ و نصیحت کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ چند آدمی بعض اقوام و قبائل سے اس مذہب میں داخل ہو گئے تھے اس طرح عرب کی سطح مذہبی پر عیسائیت کی کمزور سی کوشش کی کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی لہر نمودار ہوتی تھی۔ بعض وقت زیادہ گہری موجوں میں یہودیت کا اثر نمودار ہوتا تھا مگر اصلی بت پرستی اور (نعوذ باللہ) اسماعیلی[1] توہم پرستی کی موجیں نہایت بلند تھیں۔" یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

"بعثت سے قبل عرب کی حالت مذہبی تبدیلی قبول کرنے سے ایسی ہی دور پڑی تھی جیسے باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے سے دور تھی۔ عربوں کے مذہب کی بنیاد ایسی سخت ترین بُت پرستی تھی جس کی جڑیں نہایت گہری جا چکی تھیں جس نے صدیوں تک مصر و شام کے عیسائیوں کی تمام کوششوں کا ایسا مقابلہ کیا تھا کہ گویا ان پر کچھ اثر ہی نہ تھا۔"

عربوں کی جہالت، ان کی مذہبی وہم پرستی و بت پرستی اور ان کے بدترین اخلاق و عادات یہ وہ نقشہ و صورت ہے جس کے سامنے حیوانیت کی گردن بھی ندامت سے جھک جاتی ہے لیکن ان تمام عیوب و نقائص کے باوجود ان کے اندر کچھ اوصافِ حمیدہ بھی تھے اور اس شدید جہالت کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ چیزیں ایسی بھی پائی جاتی تھیں جنہیں علوم تو نہیں کہا جا سکتا تاہم علوم کے متعلقات و مبادیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

عربوں کے خصائص حمیدہ میں مہمان نوازی اعلیٰ درجہ کا وصف تھا جو ان کے دوست دشمن کے درمیان کوئی امتیاز نہ رکھتا تھا، بدترین سے بدترین دشمن بھی اگر کسی طرح مہمان بن گیا تو اس کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ نہایت شریفانہ اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا وہ ہر طرح اس کی خاطر تواضع کرتے اور ہر ممکن آرام و سہولت کے ساتھ اس کی جان کی حفاظت کے بھی ذمہ دار رہتے تھے۔ اس کے علاوہ محبت، دلیری، جوانمردی و فیاضی وہ متعدد اوصاف ہیں جو ان کی خوبیوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں مگر معدودے چند اچھے

---

[1] یہ سر ولیم میور کے الفاظ ہیں۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ چونکہ عرب اولاد اسمٰعیل علیہ السلام سے ہیں ممکن ہے اسی لیے میور نے ان کی توہم پرستی کو اسماعیلی توہم پرستی کا نامناسب نام دے دیا جو خود سر ولیم میور کی اپنی ایجاد ہے۔ (۱۲ مولف)

اوصاف کا کسی قوم میں پایا جانا جبکہ اس کے بالمقابل جہالت و وحشت درجہ کمال پر ہو اور لاانتہا عیوب اس قوم میں پائے جاتے ہوں، تہذیب نہیں لا سکتی۔

اب ہم قدرے تفصیل کے ساتھ ان چیزوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو عربوں میں علوم یا از قسم علوم رائج تھیں۔

علومِ عرب قبل از اسلام

وہ تمام علوم جو جزیرۃ العرب میں اسلام سے قبل رائج تھے وہ ہی علوم تھے جو اس ملک کی ضرورت اور قوم کی معاشرت کے مطابق تھے، بالفاظ دیگر عربوں کے پاس صرف وہی علوم تھے جو ان کے لیے ناگزیر تھے اور جن کے بغیر وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی نہ گزار سکتے تھے۔ ہم نے ان کی معلومات پر علوم کا اطلاق بھی دوسری اقوام کے علوم کی مشابہت و مشاکلت کی وجہ سے کر دیا ورنہ عربوں نے نہ ان کو کسی درسگاہ میں حاصل کیا تھا نہ کتابوں میں پڑھا تھا اور نہ ہی کسی استاد سے باقاعدہ یا بے قاعدہ ان کی تعلیم حاصل کی تھی، نہ انہوں نے کسی قسم کے علوم و فنون میں کچھ کتابیں تصنیف کیں کیونکہ وہ لوگ جاہل اور ان پڑھ تھے، نہ لکھنا ہی ان کو آتا تھا اور نہ پڑھنا۔ ان کے پاس صرف ان معلومات کا ذخیرہ تھا جو متعدد نسلوں کے گزر جانے پر قیاس و استنباط سے حاصل ہوا تھا اور آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا چلا آیا اور بڑھتا گیا۔

ہم نے بتلایا کہ عربوں میں ان ہی علوم نے رواج پایا جو ان کی فطرت کے لحاظ سے ضروری تھے کیونکہ ان پر بدویت غالب تھی اور رزق کی تنگی و زرعی پیداوار کے نہ ہونے نے ان کی توجہ دودھ دینے والے جانور پالنے کی طرف مبذول کر دی تھی مگر یہ بھی ان کی ضرورتوں کے لیے کافی نہ ہو سکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر باہمی جنگ و جدال ہونے لگا۔ اس خانہ جنگی اور چارہ پانی کی قلت کی وجہ سے وہ ایک جگہ سے

دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور تھے اور چونکہ ان کے یہاں مطلع صاف رہتا تھا اور آسمان کھلا رہتا تھا اس لیے ان کو نقل و حرکت کرنے کی غرض سے راستوں کی دریافت میں ستاروں کی دیکھ بھال کی ضرورت درپیش ہوئی جو آخر کار علم نجوم کی بنیاد بن گئی۔

اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ ایسے ذرائع کے محتاج ہوئے جن سے وہ دشمن کے اندرونی حالات سے واقف ہوتے رہیں اور اس کی نقل و حرکت کا صحیح اندازہ کرتے رہیں۔ اس ضرورت نے انہیں علم نقش قدم سے روشناس کرایا۔ آسمانی حوادث مثلاً بارش، آندھی اور طوفان وغیرہ سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کو بارش کی علامات اور موسمی ہواؤں کے دریافت کی ضرورت پڑی جس کو علم الانوار اور علم مہاب الریاح (پچھترو موسمی ہوا کا علم) کہتے ہیں، دوسری طرف خانہ جنگیوں نے ان کو اس امر کے لیے مجبور کیا کہ وہ گروہ در گروہ مجتمع ہو کر رہیں، اس کے لیے علم الانساب کا رواج ہوا تاکہ بوقت ضرورت ایک جدی قبائل ایک دوسرے کے مددگار رہیں اور پشت در پشت انتقام کا سلسلہ جاری رکھ سکیں، ان ہی جنگوں کی وجہ سے ان کی توجہ ہتھیاروں اور گھوڑوں کی طرف منعطف ہوئی، اس لیے وہ گھوڑوں کی تربیت، پرورش اور ان کے امراض کا علاج خوب جانتے تھے۔

جب ہم ان علوم پر نگاہ ڈالتے ہیں جو عربوں میں رائج تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو خالص عربی تھے، ان ہی کے یہاں پیدا ہوئے اور وہ خود ہی ان کے موجد تھے اور دوسرے وہ علوم تھے جن کو انہوں نے ہمسایہ اقوام سے سیکھا تھا۔ انساب، شعر، خطابت، قیافہ خالص عربی علوم ہیں اور نجم، طب، پچھتر، علم الخیل، علم مہاب الریاح (موسمی ہواؤں کا علم) علم الاصنام اور کہانت وغیرہ وہ علوم ہیں جو انہوں نے اقوام غیر سے حاصل کیے جیسا کہ ہم آئندہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

علم الانساب

اقوامِ قدیمہ کے زمانہ جاہلیت میں نسب کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا وہ لوگ اس کو بہت زیادہ اہم خیال کرتے تھے۔ ان میں سے بعض بعض افراد کو تو پورے

پورے نسب نامے ازبر ہوا کرتے تھے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ قومی و نسبی مفاخرت کے بے حد قائل تھے، ہر خاندان اور ہر قبیلہ خود کو اپنے بزرگوں کی شرافت یا ممتاز کارناموں کی وجہ سے دوسروں سے اعلیٰ خیال کرتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہر قبیلہ اپنے اندر اجتماعی و اتحادی طاقت پیدا کرنے کے لیے بھی نسب کا برقرار رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ضروری خیال کرتا تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کون سے افراد اور گھرانے ایک ہی شخص کی اولاد میں سے ہیں۔ اس معاملہ میں یونانیوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ افراد کے علاوہ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کے نسب نامے بھی محفوظ رکھتے تھے، یونانیوں میں زمانہ جاہلیت میں بہت سے افراد و شرفاء ایسے تھے جن کا نسب نامہ دیوتاؤں سے ملتا تھا، یہی حال اہلِ روما کا بھی تھا۔ جو قبیلہ ان کے یہاں بطارقہ کے نام سے مشہور تھا، وہ دیوتاؤں کی اولاد خیال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح یہودی بھی اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں شمار کرتے آئے ہیں اور اپنی قوم میں سے ہر قبیلہ کا نسب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تک پہنچاتے ہیں۔ (تاریخ تمدن اسلامی جرجی زیدان جلد ۳)

اہل عرب بھی اپنے نسب کی حفاظت کرنے میں بہت ہی زیادہ محتاط تھے اور یہ ان کے لیے بڑی حد تک ضروری بھی تھا کیونکہ وہ اپنی تمام تر عزت و شرافت حفاظت نسب میں ہی خیال کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا اپنی نسل کو بے میل رکھنے کی کوشش کرتے چونکہ یہ لوگ عام باہمی جنگ و جدال اور رقابتوں کے شکار تھے اور اس سلسلہ میں ان کو گروہ در گروہ ہو کر رہنا پڑتا تھا، اس لیے بھی نسب کی حفاظت ضروری تھی تاکہ بوقت ضرورت ایک خاندان اور ایک مورث اعلیٰ کی اولاد باہم دگر معاونت کر سکے، اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے ناموں کے ساتھ اپنے باپ دادا کا نام لگاتے تھے اور قبیلہ کا نام بھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو نسل جتنی خالص ہوگی اسی درجہ اس کے اندر شرافت و نجابت، عزت و حمیت، عالی حوصلگی اور خصائل حمیدہ ہوں گے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی شخص بھی اپنے آبائی و اجدادی عزت و اقتدار اور نیک نامی کو گرانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اسے اور زیادہ فزوں کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا، اس لیے وہ نہ صرف ان کارناموں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا جو اس کے مورث اعلیٰ کر چکے تھے بلکہ خود بھی کوئی ایسا کام

کرنے کی جستجو و جدوجہد میں رہتا تھا جس سے ہمیشہ کے لیے اس کا نام زندہ رہے۔ اس لیے عربوں میں قریش کو جو مرتبہ و فضیلت دوسرے قبائل پر حاصل تھی وہ کسی اور کو نہ تھی کیونکہ یہ خاندان "اباعن جد" ایسے ہی ممتاز کارنامے رکھتا چلا آیا تھا اور ان کا تدبر بھی ضرب المثل تھا۔ ہر شخص جس قدر ممکن ہوتا اپنا اور اپنے خاندان کا شجرہ نسب یاد رکھتا، لیکن انہی میں سے پھر ایک ایسا طبقہ بن گیا جس کا کام صرف یہ ہی تھا کہ وہ انساب یاد رکھے۔ قبیلہ کا ہر فرد ایسے شخص سے اپنے نسب کا پورا حال دریافت کر لیتا تھا۔ عرب کے مشہور نساب (نسب داں) یہ ہیں۔ مغفل، عمیرہ، ابن لسان، زید بن الکیس، نخار اور عبداللہ وغیرہ (کتاب الانساب) زمانہ اسلام میں بھی اس امر کی طرف پوری توجہ رکھی گئی اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کو کافی حد تک محفوظ رکھا یہاں تک کہ حضرت عمر خلیفہ دوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

تعلموا النسب ولا تكونوا كنبط السواد اذ سئل احدهم عن اصله قال من قريه كذا۔	نسب نامہ سیکھو اور عراق کے نبطیوں کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جب ان میں سے کسی سے پوچھا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو؟
(عبدالفرید ج ۳ ص ۲۷)	تو کہتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرب کے بہترین نسب داں تھے۔ حفاظت نسب کی اہمیت اسلام میں بھی اس قدر زیادہ تھی کہ بعد کے لوگ صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ایسے شخص کی روایت حدیث قبول نہیں کرتے تھے جو مجہول النسب ہوتا تھا یعنی جس کا نسب مشہور و معلوم نہ ہوتا تھا یہاں تک کہ علم اصول حدیث کا یہ ایک قانون بن گیا کہ اگر راوی مجہول النسب ہوگا تو اس کی روایت مردود اور ناقابلِ قبول ہوگی۔ عرب نہ صرف یہ کہ اپنے ہی انساب کی حفاظت کرتے تھے بلکہ اپنے گھوڑوں کے انساب کا بھی خیال رکھتے تھے اور یہ بھی اسی لیے کہ گھوڑوں کی نسل میں میل ہونے کی وجہ سے ان کے اندر سے وہ جدی خصائص و شرافت زائل ہو جاتی ہیں۔

علم الشعر

شعر گوئی اہلِ عرب کی فطرت میں داخل تھی چونکہ وہ کھلے میدانوں میں رہنے والے صحرا نورد قوم تھے، اس لیے آزادی و استقلال ان کی سرشت میں داخل تھی۔ آزادی نے ان کے تخیلات میں جوش و امنگ پیدا کیا، اس لیے ان کی طبائع کو شعر گوئی سے قدرتی تعلق تھا، اس کے علاوہ انہیں زبان بھی قدرت کی جانب سے ایسی مناسب و موزوں عطا کی گئی جس کی وسعت و جامعیت کو شعر و شاعری کے ساتھ خاص علاقہ تھا، اس لیے عربوں میں قدیم زمانہ سے ہی شعر گوئی کا رواج چلا آتا ہے یہاں تک کہ مورخین اس بات سے عاجز رہے ہیں کہ وہ عربوں کی ابتداء شاعری کا کوئی خاص زمانہ متعین کر سکیں مگر ہم کو ان کا جو سب سے قدیم ترین شعر مل سکا ہے وہ زمانہ اسلام سے صرف دو صدی پیشتر کا ہے چونکہ ان کے یہاں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، اس لیے ان کے کثیر اشعار ضائع ہو گئے۔ (علوم عرب جرجی زیدان)

عربوں کی تاریخ شعر گوئی سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ابتداء ان کے اشعار چھوٹے چھوٹے فقروں اور جملوں میں ہوتے تھے اور وہ ضرب الامثال کی موقع و محل کی مناسبت سے استعمال کیے جاتے تھے، زیادہ تر ان میں ناصحانہ و حکیمانہ باتیں ہوتی تھیں، یہی حالت عرصہ دراز تک قائم رہی، پھر ایک مثل کے دو حصے کر دیئے گئے اور ان کو مسجع بنا دیا گیا۔ اکثر لوگ انہیں ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، پھر بعد میں قافیہ اور وزن کی پابندی بھی کی جانے لگی کیونکہ اس سے ترنم میں حسن پیدا ہو جاتا تھا۔ قرن ہائے دراز تک یہ کیفیت رہی کہ وہ لوگ شاعری کو رجز گوئی کے لیے استعمال کرتے رہے، بعد میں جب ان کے اندر مفاخرت و منافرت کا جوش پیدا ہوا تو ان کے شاعرانہ تخیلات بھی اسی سانچہ میں ڈھلنے لگے اور رفتہ رفتہ شاعری منازل ترقی طے کرنے لگی، ہر اچھا شاعر ایک جدت پیدا کر کے اس کے محاسن میں اضافہ کر دیتا یہاں تک کہ مہلہل نے قصیدہ گوئی کی بنیاد رکھی اور اس کے پوتے امراء القیس نے اس کو منازل عروج تک پہنچایا۔

امراء القیس نے نئی نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا۔ ندرت کلام اور

لطافت خیال اس کا خاص حصہ تھا۔ اس کے طرز ادا میں ایک جدت ہے، کلام میں زور اور الفاظ پُر شکوہ ہیں۔ در حقیقت وہ عربی شاعری کا مجدد ہے جس نے اس کو کمال کی آخری منزل تک پہنچا دیا، وہ نہایت ذکی الطبع، حساس، وسیع الخیال اور پُر گو شاعر تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے عرب کی حدود سے نکل کر بلاد روم کے بھی سفر کیے تھے، اس کے خیالات یقیناً یونانیوں کے کلام سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ (علوم عرب)

اہلِ عرب نہایت کثرت سے شعر کہتے تھے ان کی شعر گوئی کا اگر اندازہ لگانا ہو تو ان کا وہ ذخیرہ دیکھ لینا کافی ہے جو اسلام سے قبل ان کی ترقی یافتہ شاعری کا ہے، انہوں نے صرف ایک یا دو صدی میں اس قدر اشعار کا ذخیرہ کر لیا کہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کئی صدیوں میں بھی اتنا ذخیرہ جمع نہ کر سکیں۔ (تمدن اسلام جرجی زیدان)

وہ اپنی منظومات میں اشعار کا اعداد و شمار نہ کرتے تھے، بلکہ قصائد کو گنتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دیوانِ حماسہ کا مولف ابو تمام جاہلیت کے علاوہ قصائد و متفرقات کی چودہ ہزار نظمیں زبانی یاد رکھتا تھا۔ (ابن خلکان) حماد کو ستائیس ہزار قصائد ازبر تھے یعنی ایک حرف تہجی پر اسے ایک ہزار قصیدے یاد تھے۔ (النجوم الزاہرہ ص ۴۲۰ ج ۱) اصمعی سولہ ہزار نظموں کا حافظ تھا۔ (ابن خلکان) ان روایتوں سے جہاں عربوں کے اشعار کی کثرت تعداد اور ذخائر کا علم ہوتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کی قوت حافظہ کس درجہ زیادہ تھی کہ وہ بڑی سے بڑی عبارت اور اشعار کی اتنی کثیر تعداد بلفظہ دماغ میں محفوظ رکھ سکتے تھے، یہ چیز ان کے لیے فقط قرآن و تدوین حدیث و تاریخ نویسی میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اس پر بھی عمرو بن العلا لکھتا ہے کہ عرب کے اشعار جو ہم تک پہنچے وہ اپنی اصلی تعداد سے بہت ہی کم ہیں اگر پورا ذخیرہ مل جاتا تو وسیع علم ہوتا۔

(المزہر ص ۲۳۷ ج ۲)

فی الحقیقت شعر گوئی عربوں کی فطرت میں داخل تھی اور شاید ہی کوئی عرب ایسا ہو جو شعر کہنا نہ جانتا ہو گا یہاں تک کہ مجنون و دیوانے اور چور بھی شعر گوئی کا مذاق رکھتے تھے، عورتوں کا ذکر ہی کیا ان کی تو بہت بڑی تعداد ہمیں شعراء کی صف میں نظر آتی ہے اور یہ بھی صرف عربوں کے خصائص میں سے، ورنہ اقوام دیگر کی تاریخ عموماً اس ذکر

سے خالی ہیں۔ بعض لوگوں میں شعر گو نہ تھے لیکن ان میں ذوق شاعرانہ ضرور تھا' اس سے دلچسپی نہ رکھنا ان کے نزدیک بہت بڑا عیب خیال کیا جاتا تھا۔ شعر کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شعراء کا نہایت درجہ احترام کرتے تھے اور ان کو بڑی وقیع نگاہوں سے دیکھتے تھے شاعر ان کے نزدیک قوم کا محافظ' اس کی عزت کا نگہبان اور ملک و قوم کا نقیب و ترجمان تصور کیا جاتا تھا۔ وہ قوم کی تاریخ و روایات اور اس کی عظمت کا حامل ہوتا تھا اور اس کے ساتھ اس کی حیثیت واقعہ نگار کی بھی تھی' اسی لیے شہسواروں سے کچھ زیادہ ہی ان کی عزت و وقعت تھی۔ وہ اپنی اولاد و احفاد کو بھی شاعر ہی دیکھنا پسند کرتے تھے جس قبیلہ میں شاعر پیدا ہو جاتا وہ خود کو زندہ جاوید خیال کرتا تھا اور اس پر بڑی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا جاتا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمیں عربوں کے عادات و اخلاق' خصائل و صفات اور علوم و معاشرت کا جس قدر بھی علم حاصل ہو سکا ہے وہ سب ان کی شاعری کا ہی مرہونِ منت ہے۔

بجستانی' ابن قتیبہ' جاحظ اور حنیفہ دینوری نے عربوں کی زمانہ جاہلیت کی تاریخ سے متعلق جنگ و جدال' حالات شعراء' مذہب و معاشرت' فراست و ضیافت اور دیگر تمام رسم و رواج شادی و غمی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تمام تر مآخذ صرف ان کی شاعری ہے' اسی لیے کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے "الشعر دیوان العرب" عرب کی شاعری عرب کی تاریخ ہے۔ شعراء کی عظمت ان کے نزدیک اس لیے اور بھی زیادہ تھی کہ شعر فطرتاً ایک نہایت موثر شے ہے' پھر ان کی وسعت زبان اور محاسن کلام نے شعر کی یہ تاثیر دوچند کر دی تھی۔ شعر کی قوتِ اثر کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مسکین داری کے سیاہ دوپٹوں کا اسٹاک اس وجہ سے بیکار ہونے لگا کہ عرب کی عورتوں میں سیاہ اوڑھنی کا رواج متروک ہونے لگا تو اس نے دو شعر کہے جن میں ایک حسینہ کی تعریف کی گئی تھی جو سیاہ اوڑھنی میں ملبوس تھی' مسکین کے ان دو شعروں نے جادو کا کام کیا اور فوراً ہی عورتوں میں سیاہ دوپٹوں کا رواج تازہ ہو گیا اور اس کا مال ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ (ابن خلکان)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی عجیب عجیب مثالیں اس قسم کی مشہور ہیں۔ اسی

لیے اہلِ عرب شعراء کی ہجو سے بہت خائف رہتے تھے اور اپنی عزت کی حفاظت اسی میں سمجھتے تھے کہ کوئی شاعر ان کی ہجو نہ کر ڈالے۔ وہ شعراء کو نذرانہ دے کر طے کر لیتے کہ وہ ان کی ہجو نہ کریں گے، اس کے مقابلہ میں شاعر جس کی مدح میں کوئی قصیدہ کہہ دیتا وہ صرف شاعر کا ہی ممدوح نہ رہتا بلکہ پوری قوم کا ممدوح ہو جاتا تھا اور آسمان شہرت کا بدر کامل ہو جاتا اس کے صلہ میں وہ شاعر کو انواع و اقسام کے انعامات سے نوازتا تھا۔

عرب کے قبائل مراتب شاعری میں مختلف درجات رکھتے تھے، قبیلہ ربیعہ کے شعراء سب سے بہتر خیال کیے جاتے تھے انہیں میں سے مہلہل، مرقش اکبر، مرقش اصغر، نافہ ابن عبدالبکری، عمرو، حارث بن حلزہ، اعشیٰ اور مسیب وغیرہ ہیں۔ ان کے بعد قیس کا درجہ تھا، اس قبیلہ میں نابغہ، زہیر، ربیعہ، لبید، حطیہ اور شماخ وغیرہ مشہور ہیں۔ قبیلہ بنی تمیم میں سے اوس اور ہذیل بڑے شاعر خیال کیے جاتے تھے۔ عرب کے لوگ اپنے عظیم شعراء کے بہترین اشعار کی اس درجہ قدر دانی کرتے تھے کہ سات قصائد جو ان کے نزدیک زبان و کلام اور ادبی محاسن و لطائف کے لحاظ سے اعلیٰ ترین تھے، ان کو سونے کے پانی سے لکھوا کر خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا۔ یہ سات قصیدے تھے اور ان کو "السبع المعلقات" یا "السبع المذھبات" کہا جاتا ہے۔

خطابت و تقریر

شعر گوئی اور خطابت میں ایک قریبی تعلق ہے اور دونوں میں مناسبت بھی ہے کیونکہ خطابت کے لیے اجتماع خیال، فصاحت لسان و بلاغت کلام کی شدید ضرورت ہے۔ مستقل مزاجی، آزاد خیالی، جوش امنگ اور جذبات کی فراوانی اس کے لازمی اجزاء ہیں اور یہی شعر گوئی کے لیے بھی ضروری ہیں چونکہ عربوں کے طبائع نہایت حساس اور بہت جلد اثر قبول کر لینے والی تھیں، اس لیے فصیح و بلیغ کلام ان پر بے حد اثر انداز ہوتا تھا۔ عربوں میں خطابت کا رواج اس لیے ہوا کہ باہمی نزاع و مفاخرت کے مواقع پر اور ایسے مواقع پر اپنے لیے اعوان و انصار جمع کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ یہ خطابت ان کے لیے اس لیے ضروری تھی کہ وہ اپنے وفود قریب کی ہمسایہ حکومتوں کے

پاس وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے تھے اور اظہار مدعا کے لیے اس سے زیادہ پر اثر ذریعہ اور کوئی نہ تھا۔ چنانچہ آل منذر جو حیرہ میں حکمران تھے اپنے اکثر وفود شاہانِ فارس کے پاس بھیجتے رہتے تھے جو کہ ان کی بڑی سرپرست حکومت تھی۔ ایسے ہی یمن اور مشرقی عرب سے بھی عمال کی شکایت کے لیے عموماً اپنے وفود حکام بالا کے پاس بھیجا کرتے تھے اور ان تمام امور کے لیے خطابت لازمی چیز تھی اس لیے وہ خطابت کی طرف مائل ہوئے۔

(علوم عرب)

ازمنہ جاہلیت میں شعراء کی طرح خطیب بھی کثرت سے ہوتے تھے ہر قبیلہ کا ایک شاعر اور ایک خطیب ضرور ہوتا تھا بغیر ان کے پورا قبیلہ گویا یتیم تھا۔ اس زمانہ کے مشہور خطباء میں قیس بن ساعدہ اور سحبان وائل بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے آخرالذکر تو بہت ہی مشہور ہے جس کی فصاحت نہ صرف عرب میں زبانِ زد عوام و خواص تھی بلکہ تمام دنیا میں اس کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جس کی تقریر کرتا تھا پسینہ میں شرابور ہو جاتا' اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی بڑی بڑی تقریروں میں نہ کسی لفظ کو دہراتا تھا نہ درمیان میں کوئی لفظ سوچنے کے لیے ٹھہرتا تھا' اس کی تقریر ایک پرسکون سمندر کی طرح تھی جس کی سطح پر اس کی زبان کی کشتی رواں دواں بے روک ٹوک جاری ہو جاتی۔ اس کے علاوہ دیگر خطباء یہ تھے قبیلہ حمیر میں درید اور زہیر دیگر قبائل میں قیس' ربیعہ اکثم بن صفی اور عمرو بن کلثوم بہت مشہور تھے۔ یہ سب کے سب نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے' ان کی تقریر کا ہر جملہ بلکہ ہر لفظ موقع اور محل کے نہایت مناسب ہوتا تھا جو طبائع میں بے حد اثر پیدا کرتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں شاعر کا درجہ خطیب سے بمراتب بلند خیال کیا جاتا تھا لیکن اسلام نے شاعر کے درجہ کو گھٹا دیا' محض اس لیے کہ شعراء بالعموم اپنے کلام میں اس درجہ مبالغہ پیدا کرتے جو صراحتاً جھوٹ ہوتا تھا' بعض اشعار محض ان کے تخیل کی پیداوار ہوتے تھے اور ان کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ ہوتا' اسلام میں شاعر کا درجہ اس وجہ سے خود بخود ہی کم ہو گیا کہ تبلیغ کے لیے اسلام کو خطیبوں کی تو بے حد ضرورت تھی شعراء کی نہیں' اس لیے اسلام میں خطیب کو جو مرتبہ ملا وہ شاعر کو میسر نہ آ سکا۔

اپنے ادب اور ادبی ذوق کو بلند کرنے اور اسے زندہ رکھنے کے لیے انہوں نے مختلف ذرائع اختیار کر رکھے تھے جن میں وہ بازار اور میلے قابل ذکر ہیں جو بغرض تجارت لگائے جاتے تھے بعض میلے مذہبی رسوم ادا کرنے کی غرض سے لگتے تھے انہیں میلوں کو انہوں نے ادب اور ادبی ترقیوں کی آماجگاہ بنالیا تھا' ملک کے گوشہ گوشہ سے شعراء و ادباء ان مواقع پر مجتمع ہوتے اور ادبی مجالس گرم ہوتیں' ہر شاعر اپنا مایہ ناز کلام ایک دوسرے کو سناتا اور اس سے وہ اپنی ادبی ذوق کی تشنگی بجھا لیتے۔ ان تمام مذکورہ میلوں میں سوق عکاظ کی بڑی اہمیت تھی' اسی میلے میں وہ ساتوں قصیدے پڑھے گئے جو عربی ادب کا شاہکار ہیں اور جنہوں نے السبع المعلقات یا السبع المذہبات کے نام سے تاریخ میں شہرت دوام حاصل کی۔ ان میلوں کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی تھا کہ عربوں کے ذوق ادب میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی تھی اور حاضرین میں جوش و اشتیاق پیدا ہو جاتا تھا۔

قیافہ شناسی

منجملہ اور علوم کے قیافہ شناسی کا شمار بھی عربوں کے خود ساختہ علوم میں سے ہے جس کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا اور دیگر اقوام سے اس کو نہیں سیکھا تھا' اس علم کی طرف بھی انہیں شدید احتیاج تھی اور اسی احتیاج و ضرورت نے انہیں اس کی ایجاد پر مجبور کیا تھا۔ اس کی دو قسمیں ہیں: قیافۃ الاثر اور قیافۃ البشر۔ قیافۃ الاثر کا مطلب یہ ہے کہ انسانی نقش قدم یا گھوڑے اور اونٹ وغیرہ کے پیروں کی شناخت و پہچان حاصل کرنا۔ یہ علم ان کے لیے بے حد کارآمد علوم میں سے تھا اور اس سے وہ بڑے بڑے کام نکال لیتے تھے۔ یہی وہ علم تھا جس کے ذریعہ سے وہ بھاگے ہوئے آدمی اور گم شدہ جانوروں کا پتہ لگا لیتے تھے۔ اس علم میں انہوں نے اس درجہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ وہ بوڑھے اور جوان' مرد اور عورت' عورتوں میں شادی شدہ و غیر شادی شدہ کی شناخت بھی صرف ان کے نشان قدم ہی کے ذریعہ سے حاصل کر لیتے تھے' یہاں تک کہ وہ یہ اندازہ بھی لگا لیتے تھے کہ اس راستہ سے گزرنے والا انسان یا جانور جسمانی اعتبار سے توانا

و تندرست ہے یا کمزور' لاغر اور بیمار۔

قیافہ کی دوسری قسم کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے چہرے بشرے اور اعضاء ظاہری کی اشکال و تناسب سے اس کے کچھ باطنی خصائص و خصائل اور عادات و حالات کا پتہ لگایا جائے اور یہ معلوم کیا جاسکے کہ وہ کس قبیلہ کا ہے اور کس باپ کا بیٹا ہے؟ اس علم میں بھی عربوں کو کچھ کم کمال حاصل نہ تھا' البتہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ علم فراست الید میں عربوں کو کتنا دخل تھا اور کس درجہ معلومات تھیں؟ لیکن عربوں کے مذکورہ بالا دونوں علوم کی واقفیت و مہارت سے ہمارا خیال ہے کہ وہ یقیناً علم فراست الید سے بھی ضرور واقف ہوں گے اگرچہ ہم تک ان کی وہ روایات نہیں پہنچ سکیں۔ البتہ ان کے علم قیافہ کے بارے میں ہم تک جو کچھ معلومات پہنچی ہیں ان سے یہ یقین ہوتا ہے کہ عرب اس علم میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور یہ علم ان سے زیادہ کوئی دوسری قوم نہ جانتی تھی۔ ویسے تو عرب کا ہر فرد اس سے واقف تھا لیکن بعض قبائل اس علم میں خاص امتیاز و خصوصیت کے حامل تھے اور وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اس میں مخصوص دلچسپی لی تھی اور بہت زیادہ محنت کی تھی' اس میں مشہور ترین بنی مدلج اور بنی لہب تھے۔ اب تک بھی یہ علم نجد کے ایک قبیلہ میں پایا جاتا ہے' یہ لوگ موجودہ زمانہ میں اس علم کو سب سے بہتر جانتے ہیں اگرچہ انہوں نے اس سلسلہ میں کتابیں وغیرہ نہیں لکھیں تاہم ان میں سے بعض لوگ صرف نقش قدم دیکھ کر آدمیوں کو پہچان لیتے ہیں۔ بعض لوگ اونٹ کا نقش قدم دیکھ کر بتلا دیتے ہیں کہ یہ فلاں کا اونٹ ہے اور ایسے لوگ تو بے شمار ہیں جو اس امر کا امتیاز کر لیتے ہیں کہ یہ نقش قدم عراقی کا ہے یا شامی کا' مصری کا ہے یا مدنی کا۔ (تمدن اسلام جرجی زیدانی) جیسے آج کل ہندوستان میں قیافۃ البشر کا بڑا ماہر قطب الدین (کانپور) ہے جو ہر انسان کی شکل و صورت اور وضع قطع دیکھ کر اس کے نسبی حالات و دیگر بہت کچھ چیزیں بتلا دیتا ہے۔

بہرحال عربوں کو علم قیافہ و فراست میں بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ انسان کی وضع شکل اور رنگ دیکھ کر اس کے اخلاق اور عادات سے پوری واقفیت حاصل کر لیتے تھے اور یہی ان کی ذکاوت طبع کی روشن دلیل ہے۔ ہجرت کے وقت مشرکین مکہ کا حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کی گزرگاہ معلوم کر کے غار ثور کے منہ تک پہنچ جانا اور نبوت کے اعلان سے قبل ایک موقع پر ایک اجنبی عورت کا آپ کو دیکھ کر یہ بتلانا کہ یہ شخص بے ایمان نہیں ہو سکتا، عربوں کے قیافہ شناس ہونے کی وجہ سے ہی تھا۔

علم نجوم

وہ علوم جو عربوں نے دیگر اقوام سے حاصل کیے ان میں سے ایک علم نجوم بھی ہے۔ یہ علم عربوں نے کلدانیوں سے حاصل کیا کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہی قوم علم نجوم میں دنیا بھر کی استاد ہے۔ ان ہی سے یونانیوں، ہندوؤں، مصریوں اور دیگر اقوام نے سیکھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں جب اہل فارس نے کلدانیوں کے ملک پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ان پر تشدد کر کے ان کے معابد کو مٹا ڈالا تو یہ بات ان پر نہایت شاق گزری اور ان میں سے بہت سے لوگ اپنے قریب کے ہمسایہ ملکوں میں چلے گئے، ان کی اس ہجرت کا رخ بلاد عرب کی طرف خاص طور سے تھا کیونکہ ان کے خیال میں یہی علاقہ ان کے لیے سب سے محفوظ تھا اس کا ریگستانی و دشوار گزار علاقہ ہونا ہر بیرونی حملہ آور دشمن کے لیے سخت ہمت شکن تھا پھر یہ کہ کلدانیوں کی زبان بھی عربی سے ملتی جلتی تھی کیونکہ یہ دونوں ایک ہی زبان سمیا لیتقی کی شاخیں تھیں۔ ان مہاجرین میں ایک جماعت کاہنوں اور نجومیوں کی بھی تھی۔ عربوں نے ان ہی لوگوں سے علم نجوم حاصل کیا۔ ستاروں کے نام ان کے خواص، بروج اور مقامات اور شمس و قمر کی منازل معلوم کیں اگرچہ اس سے قبل بھی اہل عرب بطور خود کچھ نہ کچھ نجوم کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔

تاہم فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ عرب علم نجوم میں کلدانیوں کے مرہون منت ہیں۔ اس امر کا یقین ہمیں اس چیز سے ہوتا ہے کہ عربی میں سیارگان، بروج اور منازل کے جو نام ہیں وہ لفظاً اور معنی کلدانی ناموں کے بہت زیادہ مشابہ ہیں مثلاً عربی زبان میں ایک سیارہ کا نام ہے مریخ اور اس کو کلدانی زبان میں مرواخ کہتے ہیں دونوں میں زبردست لفظی مشابہت ہے۔ اسی طرح زحل کو کلدانی میں کاوان کہتے ہیں۔ دونوں

کے معنی بلندی کے ہیں۔ حمل کو کلدانی میں امرا، ثور کو ثورا، عقرب کو عقربا، سرطان کو سرطان، دلو کو دولا اور اسد کو اریا کہتے ہیں، حوت کو کلدانی میں نون کہتے ہیں، دونوں کے معنی مچھلی کے ہیں۔ الفاظ اور معنی کی یہ مشابہت ہمیں یہ مان لینے پر مجبور کرتی ہے کہ علم نجوم کی اصطلاحیں عربوں نے کلدانیوں سے حاصل کیں۔ (تاریخ تمدن اسلامی)

اگرچہ ان میں سے بعض بعض اصطلاحیں بالکل جداگانہ بھی ہیں جن میں کوئی مشابہت نہیں لیکن اس سے اصل مقصد کو کچھ ضرر نہیں پہنچا کیونکہ اعتبار اکثر کا ہوتا ہے۔

سیاروں کی پہچان میں بھی عرب مشہور ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ سیاروں، بروج اور ثوابت کی ایک بہت بڑی تعداد کو پہچان لیتے تھے۔ انہوں نے علم نجوم کلدانیوں سے سیکھا ضرور لیکن اس میں ترقی کرنے اور اس کو اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں ان کی ذکاوت طبع اور ذہانت کو بڑا دخل ہے۔ ابن قتیبہ اپنی کتاب تفضیل العرب علی العجم "(عربوں کی فضیلت غیر عرب پر)" میں لکھتا ہے کہ "عرب بہ نسبت تمام اقوام کے ستاروں کے طلوع و غروب کے حالات سے زیادہ واقف ہیں۔" (البیرونی ص ۲۳۸)

اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کیونکہ ان کے لیے سفر کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہ تھا جب تک انہیں ستاروں کا حال معلوم نہ ہو جاتا۔ ستارے ہی سفر میں ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب کوئی شخص کسی شہر کا راستہ دریافت کرتا تو اس سے کہہ دیتے کہ فلاں ستارے کی سیدھ پر چلے جاؤ۔ وہ اسی سیدھ پر جاتا اور منزل مقصود پر پہنچ جاتا۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے بعض خاندان علم نجوم میں بہت ماہر و مشہور گزرے ہیں، ان ہی میں سے بنو ماریہ بن کلب اور بنو مرہ ابن ہمام شیبانی ہیں۔ (البیرونی ص ۳۳۹)

کہانت

یہ ایک زبردست مگر ناقص قوت ادراکی کا نام ہے جو مخصوص قسم کی ریاضت جسمانی و مشقت بدنی کے ذریعہ سے حاصل ہو جاتی ہے اور جس کے ذریعہ سے انسان

بعض ماوراء الحواس غیبی قسم کی چیزیں جان لینے پر قادر ہو جاتا ہے، اگرچہ ان کے صحیح ہونے کا خود اس کو بھی یقین نہیں ہوتا۔ (مقدمہ ابن خلدون)

عربوں میں کہانت ان ہی ذرائع سے پہنچی جن ذرائع سے علم نجوم پہنچا تھا جن کا ذکر ہم اس سے پیشتر کر چکے ہیں۔ عربوں کے نزدیک کاہنوں کا جو درجہ تھا وہ ان بے شمار واقعات سے معلوم ہوتا ہے جو ان کی تاریخوں میں مذکور ہیں یہاں تک کہ ان کا کوئی کام بغیر کاہنوں کے مشورہ کے نہ ہوتا تھا۔ کاہن ان کے نزدیک حکیم، عالم، فلسفی اور مذہبی پیشوا تک ہوتا تھا۔ (تمدن اسلامی جرجی زیدان)

کاہنوں کے بارے میں عربوں کے مختلف خیالات تھے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ کاہنوں کو یہ علم ان ارواح کے ذریعہ سے ہوتا ہے جو بتوں میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان کے پاس ملائکہ (فرشتے) آتے ہیں، کچھ کا اعتقاد یہ تھا کہ ان کے پاس جنات آسمان سے خبریں لاتے ہیں۔ وہ لوگ اپنا علاج کاہنوں سے کراتے تھے۔ کاہن کبھی ان کا علاج جنتر منتر کے ذریعہ کرتے، کبھی جھاڑ پھونک سے اور کبھی دوائیں استعمال کراتے۔

عرب کے کاہنوں میں خنافر بن توام اور سواد بن قارب کا نام مردوں میں اور طریفہ یمنی، زھرا حضری، سلمہ ہمدانی، عفیرہ حمیری اور فاطمہ بکیہ کا نام عورتوں میں بہت مشہور ہے۔ (جرجی زیدان) شق اور سطیح بھی بہت بڑے کاہنوں میں شمار کیے جاتے تھے جن کے متعلق عربوں کے واہمہ نے نہایت لغو اور بعید از عقل و قیاس قصے اور کہانیاں مشہور کر دی تھیں۔

طب

یہ ایک فطری علم ہے جو ہر قوم اور ہر ملک میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہا ہے لیکن اس کی بنیاد کا شرف بھی کلدانی کاہنوں کو حاصل ہے۔ وہ پہلی قوم ہے جس نے امراض کا علاج دریافت کیا۔ وہ لوگ اپنے مریض کو سڑکوں پر ڈال دیتے تھے اور جب وہاں سے کوئی ایسا شخص گزرتا جو اس مرض میں مبتلا رہ چکا ہوتا تو وہ بتلا دیتا تھا کہ

کس غذا، دوا یا ذریعہ سے اس نے شفا پائی تھی۔ اس دوا کو وہ لوگ تختیوں پر لکھ کر رکھ لیتے تھے اور طب کے دیوتا کے ہیکل کی گردن میں ڈال کر سجا دیتے، اسی لیے علم طب ان کے یہاں صرف کاہنوں میں ہی مخصوص تھا۔ اہلِ بابل سے دوسری قدیم اقوام نے یہ علم حاصل کیا ان ہی میں سے عرب بھی ہیں لیکن جب یہ علم یونانیوں میں منتقل ہو کر آیا تو انہوں نے اس میں بیش بہا اضافے کیے اور اس کی تدوین و ترتیب بھی کی، ان سے پھر اہلِ اٹلی و فارس نے سیکھا چونکہ عرب کا ملک ان دونوں حکومتوں کے درمیان واقع تھا، اس لیے اہلِ عرب نے طب کو اس ترقی یافتہ شکل میں ان سے اخذ کیا اور کچھ اپنے تجربات بھی اس میں اضافہ کیے اور ان سب کا مجموعہ علم طب بن گیا۔ ابتداءً ان کے یہاں بھی طبیب کاہن ہی ہوتا تھا جیسا کہ اہلِ بابل کا قاعدہ تھا۔ علاج کے بھی ان کے یہاں دو طریقے تھے: ایک علاج دواؤں کے ذریعہ اور دوسرا کہانت کے ذریعہ سے۔ علاج میں وہ صرف مفرد دوائیں استعمال کرتے تھے جس میں شہد کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔ خصوصاً امراض شکم میں تو وہ اس کو اکسیر خیال کرتے تھے۔ بعض امراض میں وہ پچھنے لگوانے اور بعض میں داغنے اور بعض میں فصد کھلوانے سے کام لیتے، یہ بھی ان کے یہاں علاج کے طریقوں میں سے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں بہترین ماہر فصاد و حجام پائے جاتے تھے۔ بعض قسم کے بخاروں میں گرم پتھروں پر لیٹنا اور بعض میں سرد پانی سے نہا لینا مفید خیال کیا جاتا تھا۔

عرصہ دراز تک عربوں میں طبیب و کاہن ایک ہی شخص ہوتا تھا لیکن بعد میں طبابت کے ساتھ قیافہ دانی اور علم نجوم کو بھی شریک کر دیا گیا، یہ صرف عربوں کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا بلکہ اس زمانہ کے جملہ اطباء بلا استثناء عرب و عجم طبابت کے ساتھ ان دونوں علوم میں سے ایک کو ضرور جانتے تھے۔ ہندوستان میں بھی بیسویں صدی کی ابتدا تک اطباء کے بارے میں ایسی ہی روایات مشہور ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، البتہ بیسویں صدی کے ربع گزر جانے کے بعد یہاں بھی طب، نجوم اور قیافہ بالکل الگ الگ ہو گئے۔

عربوں کے مشہور اطباء میں سب سے اوّل لقمان ہیں، ان کے بعد قبیلہ تیم

الرباب سے ابن حذیم اور حارث بن کلدہ ہیں۔ آخر الذکر طائف کا باشندہ تھا اور بنی ثقیف سے تھا، یہ اسلام بھی لائے اور ۱۳ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ تمدن اسلامی)

پنچھتر اور موسمی ہواؤں کا علم

یہ بھی عربوں کو ان کی ضرورت نے سکھایا تھا چونکہ ان کی زندگی عموماً سفر میں گزرتی تھی اس لیے ضروری تھا کہ بارشوں اور موسمی ہواؤں کے حالات سے واقف ہوں کیونکہ ان کے یہاں بعض اوقات ایسی ہوا بھی چلتی تھی جو پورے قافلہ اور قبیلہ کو تباہ و برباد کر دیتی تھی جس کو وہ اپنی زبان میں "خمسین" کہتے تھے۔ موسمی ہواؤں اور بارش سے جو علم متعلق تھا وہ اسے علم الانواء یعنی علم پنچھتر کہتے تھے۔ اس علم میں کواکب و نجوم کے طلوع و غروب کا حال بیان کیا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک موسموں کا تغیر اور بارشوں کا ہونا انہیں کواکب کے طلوع و غروب کے زیر اثر تھا، ان کے اشعار میں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موسم کی تبدیلیوں اور آسمانی حوادث کو مختلف ستاروں کے طلوع و غروب کا اثر خیال کرتے تھے جیسے:

اما قارن القمر الثریا
لثالثہ فقد ذہب الشتاء

"جب قمر اور ثریا تیسرے ستارے سے مل جائیں تو سمجھو کہ جاڑے کا موسم ختم ہو گیا"

اذا ما البدر تم لہ الثریا
اتاک الرد اذلہ الشتاء

"جس وقت بدر ثریا کے ساتھ پورا ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ جاڑے کی ابتدا ہو گئی"

وتدبر اللیل التمام باھلہ
واصبحت العواء للشمس منزلا

"رات اب لوگوں کے لیے ٹھنڈی ہو گئی کیونکہ آفتاب منزل عواء میں آ گیا"

یہ اور اسی طرح اور بہت سے اشعار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کو اس علم سے کتنا شغف تھا؟ وہ اس علم کے اس درجہ معتقد ہو گئے تھے کہ کواکب کی تاثیر کو

بالذات خیال کرنے لگے تھے۔ کلدانیوں کی طرح ان کا اعتقاد تھا کہ نجوم کی تاثیر انسان کے اعمال و افعال پر ہوتی ہے۔ (البیرونی) جیسا کہ ہند کے جملہ غیر مسلموں کا یہی اعتقاد ہے اور ابھی تک اسی قدامت پرستی کا شکار ہیں۔

تاریخ

اہلِ عرب کے پاس کوئی تاریخ نہ تھی، وہ چونکہ جاہل و امی قوم تھے اس لیے ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ اپنی قومی تاریخ محفوظ رکھ سکتے، اپنی لڑائیوں کا حال عموماً وہ منظوم کر لیتے تھے اور ان نظموں کو زبانی یاد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ عرب کے مشہور واقعات جیسے سد مآرب، جنگ ابی کرب جس نے یمن کو فتح کیا تھا، شاہ ذونواس کا حملہ، اصحاب الاخدود کا قصہ، حبشہ و یمن کی لڑائی، اصحاب فیل کا واقعہ، اہلِ فارس کی یمن پر چڑھائی، بنی جرہم کی حکایات، زمزم کا واقعہ، کعبہ کی تاریخ، نجار کی لڑائی، حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا بلقیس کی حکایت اور یہ بے شمار واقعات انہیں زبانی یاد تھے، ان کے سینے ان تمام تاریخی واقعات کے خزانے تھے جس میں ان کی تمام قومی و ملکی تاریخ کا ذخیرہ تھا، لیکن بایں ہمہ ان کے پاس کوئی ایسی مرتب شدہ تاریخ نہ تھی جس کو صحیح معنوں میں تاریخ کہا جا سکے یا جو محفوظ رہ سکتی۔
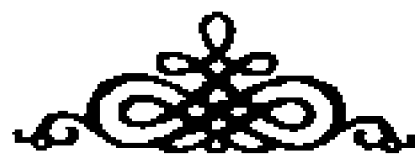
ظہورِ اسلام

ایک نئے تمدن کی بنیاد، ایک نئی زندگی کا آغاز

سردار دو جہاں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت تمام دنیا خصوصاً عربوں کے لیے رحمت ہے۔ سنت الٰہیہ یہ رہی کہ جب کسی قوم میں گناہ اور اللہ کی نافرمانی بہت بڑھ جاتی ہے شرک و کفر، بدکاری، زناکاری، ظلم و ستم کا دور دورہ ہوتا ہے، معاشرہ بدترین خرابیوں اور برائیوں کا شکار ہو جاتا ہے، غریبوں اور کمزوروں کو جینے کا حق نہیں دیا جاتا، خوف خدا باقی نہیں رہتا اور جو شخص خداشناسی کی طرف بلائے اسی کے دشمن ہو جاتے ہیں تو پھر ان پر عذاب الٰہی آجاتا ہے جس سے وہ سب تباہ و ہلاک ہو جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ دوسری قوم پیدا فرماتا ہے یا پھر ان کی اصلاح کے لیے کوئی ہادی و مصلح پیدا فرماتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریف لانے کے بعد نبیوں کے آنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اب ہادی و مصلح اور علماء و صلحاء اور اولیاء اللہ آتے ہیں اور وہی رشد و ہدایت کا کام کرتے ہیں۔

عربوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا کہ ان کی بدترین معاشرت اور تباہ کن خرابیوں اور بدترین شرک و کفر اور خوفناک ظلم و جبر اور ہلاکت خیز گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کو تباہ و برباد نہیں کیا، بلکہ ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے

آخری رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لیے اور ساری کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

آپ کی ولادت باسعادت

آپ کی ولادت پاک شہر مکہ میں ہوئی اور آپ کی وفات شہر مدینہ میں ہوئی۔ یہ دونوں شہر حجاز کے علاقے میں واقع ہیں ان کا درمیانی فاصلہ تقریباً پونے تین سو میل ہے۔ حجاز جزیرۃ العرب کا ہی ایک حصہ ہے۔ آپ کی پیدائش خانہ کعبہ کے قرب و جوار میں ہوئی جو شہر مکہ میں ہے تمام عرب سے لوگ خانہ کعبہ کی زیارت و طواف کرنے ہر سال آتے تھے اور اب ساری دنیا سے مسلمان اس کی زیارت اور طواف کرنے آتے ہیں اور فریضہ حج ادا کرتے ہیں۔ آپ کی ولادت واقعہ فیل[1] کے پچپن دن بعد مورخہ ۱۲ ربیع الاوّل شریف مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی، پیر کا دن تھا اور صبح صادق کا وقت تھا۔ آپ کے والد کا نام عبداللہ تھا اور والدہ کا نام آمنہ، دونوں قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا انتقال آپ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گیا تھا آپ یتیم پیدا ہوئے اور دنیا کو یہ سبق دیا کہ یتیم ہونا کوئی عیب کی بات نہیں، یتیم بھی بڑے برکت والے ہوتے ہیں۔ اس لیے یتیم کو بدقسمت یا منحوس ہرگز نہ کہا جائے کیونکہ یتیم بڑے بڑے

[1] واقعہ فیل یہ تھا کہ یمن کے گورنر نے (جو ایران کی طرف سے وہاں مقرر تھا) خانہ کعبہ کو گرانے اور مٹانے کیلئے اپنے ایک کمانڈر ابرہہ نامی شخص کی کمان میں مکہ معظمہ پر حملہ کرنے کیلئے ایک لشکر جرار بھیجا کہ وہ مکہ شہر کو تاخت و تاراج کرے اور خانہ کعبہ کا نام و نشان مٹا دے۔ ابرہہ اپنے فوجیوں کے ساتھ ہاتھی بھی لایا تھا جو عربوں نے کبھی نہ دیکھے تھے اور اس جانور کو دیکھ کر ڈر گئے اور مکہ خالی کر دیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دادا عبدالمطلب نے آپ کے وسیلے سے دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کرنے کیلئے ابابیل (چھوٹے سے پرندہ) کا ٹڈی دل لشکر بھیجا جن کی چونچوں اور پنجوں میں چنے کے دانہ سے بھی چھوٹی تین تین کنکریاں ہر ایک کے ساتھ تھیں۔ وہ انہوں نے ابرہہ کے لشکر پر برسائیں، وہ کنکری جس پر گرتی وہ بدن کے پار ہو جاتی، اس طرح ابرہہ کا لشکر تباہ ہو گیا اور مکہ و خانہ کعبہ محفوظ رہا۔ لوگوں نے اس فتح کو آپ کی پیدائش کی برکت سمجھا۔ (۱۲ مولف)

بلند مقام پر پہنچے ہیں۔ آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا نام محمد رکھا۔ آپ کی ولادت سے پہلے اور آپ کی ولادت کے بعد کچھ ایسے فیوض و برکات ظاہر ہوئے اور ایسی حیرت انگیز چیزیں دیکھنے میں آئیں جو عقل و دانش کے لیے بڑی حیران کن تھیں جو ایک نئے نظام اور نئے انقلاب کی آمد کی خوشخبری دے رہی تھیں جو دنیا کے لیے باعث رحمت و آرام ہو، یہ عقل کو حیرت میں ڈالنے والی چیزیں ایک پاکیزہ و بہتر تہذیب و تمدن کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے برحق نبی ہیں، اس لیے آپ کی ولادت عام انسانوں جیسی نہیں، نہ آپ کا بچپن، نہ جوانی، نہ آپ کی پوری زندگی عام انسانوں جیسی، پیدا تو آپ انسان ہی ہوئے ہیں اور آپ اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے لیکن آپ کا مرتبہ اور مقام اور آپ کے فضائل و کمالات، آپ کے اخلاق و عادات، آپ کی عبادات و معاملات اس درجہ اعلیٰ اور مرتبہ کمال پر ہیں کہ کوئی بھی بلا استثناء وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، اس لیے نہ کوئی آپ جیسا ہو سکتا ہے اور نہ آپ دوسروں جیسے ہیں قطعاً دلیل کی روشنی میں ہے کیونکہ آپ تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے اور آپ کی نبوت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے اور کوئی امتی نہ نبی جیسا ہو سکتا ہے نہ نبی کے برابر، پھر یہ کہ آپ سب کے لیے رحمت ہیں، مخلوقات میں سے کوئی آپ کے لیے رحمت نہیں، اس لیے آپ بے مثل و بے مثال ہیں۔

ولادت کے موقع پر آپ کے فیوض و برکات

(۱) اصحاب فیل (ہاتھی والوں) کا لشکر قہر الٰہی سے تباہ و برباد ہوا۔ ابابیلوں نے اس پر کنکریوں سے بمباری کی اور ناکام و نامراد ہوا، مکہ والوں کو راحت کا سانس ملا، مکہ والوں نے اس کو آپ ہی کی برکت کہا۔

(۲) اس سال عرب میں اس قدر بارش ہوئی کہ جس زمین میں کبھی پیداوار نہ ہوئی تھی اس میں فراوانی سے غلہ پیدا ہوا۔ باغوں میں پھل بڑے رسیلے اور کثرت سے پیدا ہوئے، موسم نہایت خوشگوار اور پُر بہار ہو گیا۔

(۳) فارس کا آتش کدہ جس میں ہزار سال سے آگ برابر جلتی آ رہی تھی، آتش

پرست اسے کبھی ٹھنڈا نہ ہونے دیتے تھے، اچانک ٹھنڈا پڑ گیا۔

(۴) ولادت کی اسی رات میں مضبوط و مستحکم ایوانِ کسریٰ (شاہ ایران) لرز اٹھا اور اس زلزلہ سے اس ایوان کے چودہ کنگرے گر گئے۔

(۵) خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تمام بُت (مورتیاں) اوندھے منہ گر گئے۔

(۶) آپ کی ولادت کے وقت آپ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جسم سے ایک عظیم الشان نور نکلا جس سے مشرق و مغرب روشن ہو گئے۔

(۷) ہمدان اور قم کے درمیان واقع دریائے "ساوہ" اچانک خشک ہو گیا جس سے وہاں کی آبادی کو بڑی راحت ملی۔

(۸) شام اور کوفہ کے درمیان "وادی ساوہ" جو نامعلوم زمانہ سے خشک و بے آب گیاہ پڑی تھی، اِس وجہ سے وہاں کی زرعی زمینیں ناکارہ پڑی تھی، اس وادی میں پانی جاری ہو گیا اور ساری وادی سرسبز و شاداب ہو گئی۔

ان تمام فیوض و برکات پر اتنی مستند تاریخی شہادتیں ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں ہر سیرت نگار نے لکھا ہے۔

آپ کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے آپ کو دودھ آپ کے چچا ابو لہب (جو بعد میں آپ کا سخت دشمن بن گیا تھا) کی باندی ثوبیہ نے پلایا، پھر آپ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ نے آپ کو دودھ پلایا، اس کے بعد مکہ والوں کے رسم و رواج کے مطابق قبیلہ بنی سعد کی ایک عورت حلیمہ نام کی، آپ کو دودھ پلانے اور آپ کی پرورش کرنے کے لیے اپنے گاؤں لے آئیں۔ حلیمہ نہایت درجہ غریب تھیں، ان کے جانور بھی لاغر اور دودھ دینے والے نہ تھے۔ خود حلیمہ کی چھاتیوں میں بھی دودھ کم تھا جو ان کے اپنے بچے کے لیے بھی ناکافی رہتا مگر جب حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کو لے کر آئیں، آپ کے گھر کا حلیہ آپ کی برکت سے بدل گیا۔ ان کے تمام جانور فربہ ہو گئے، ان کے تھن دودھ سے بھر گئے، خود حلیمہ کی چھاتیوں میں دودھ بکثرت ہو گیا۔ گھر میں نہایت درجہ خوشحالی آ گئی اور حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر نے آپ کو بڑا برکت والا سمجھا اور آپ سے بے پناہ محبت کرنے لگے۔ دودھ پینے کے زمانہ ہی میں آپ انصاف سے کام لیتے۔ آپ نے ہمیشہ

حضرت حلیمہ کی ایک چھاتی کا دودھ پیا اور دوسری طرف کا اپنے دودھ شریک بھائی کے لیے چھوڑ دیتے۔ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ آپ ایک ایسا تمدن و معاشرت قائم کرنے آئے ہیں جس میں عدل و انصاف ہوگا، مساوات ہوگی، صلۂ رحمی ہوگا اور حقوق کی ادائیگی ہوگی۔

چار سال آپ اپنی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کے پاس رہے۔ حلیمہ سعدیہ کے بیان کے مطابق زمانہ شیر خوارگی میں بھی اور اس کے بعد عہد طفولیت میں بھی آپ سے عقل کو حیرت میں ڈالنے والی چیزیں اور واقعات ظاہر ہوتے رہے۔ آپ کبھی بچوں کے ساتھ کھیل کود اور لغو کاموں میں شریک نہیں ہوئے۔ اگر بچے بلاتے بھی تو آپ کا جواب ہوتا کہ میں لغو کاموں کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ اس طرف راہنمائی تھی کہ انسانی زندگی لہو ولعب، تضیع اوقات، لغو، فضول اور بے ہودہ کاموں کے لیے نہیں ہے بلکہ مخلوق خدا کی خدمت، ہمدردی اور خیر خواہی کے لیے ہے۔ آپ بچپن سے بڑوں کا احترام و ادب فرماتے تھے۔ کبھی کبھی آپ حضرت حلیمہ کے جانوروں کی حفاظت کے لیے جنگل میں بھی چلے جاتے تھے تاکہ حلیمہ کی بکریوں کی بھیڑیوں سے حفاظت کریں۔ اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ آپ بنی نوع انسان کو شیطان بھیڑیے سے بچانے اور برائیوں سے ان کی حفاظت کرنے آئے ہیں۔ نہ صرف انسانوں بلکہ بے زبان جانوروں پر بھی رحم و شفقت اور ان کے ساتھ محبت کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

حضرت آمنہ کی وفات

چار سال کی عمر میں حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو آپ کی والدہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہنچا دیا۔ حضرت آمنہ مدینہ منورہ کے ایک خاندان بنی نجار سے وہب بن عبد مناف کی بیٹی تھیں۔ وہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں، وہاں سے واپسی میں مقام ابواء پر ان کا انتقال ہو گیا اور چھ سال ہی کی عمر میں ماں کی شفقت و محبت کا سایہ بھی آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد آپ کے دادا عبدالمطلب کو آپ کی پرورش کی سعادت حاصل ہوئی اور جب آپ کی عمر مبارک آٹھ سال ہوئی تو آپ کے دادا

عبد المطلب کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ ذمہ داری آپ کے چچا ابو طالب کے حصہ میں آئی۔ ابو طالب آپ سے بے حد محبّت فرماتے تھے، ہر وقت اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے ایک بار ابو طالب آپ کو اپنے تجارتی سفر میں ملک شام کی طرف لے گئے، اس وقت آپ کی عمر مبارک بارہ سال تھی، راستہ میں بصریٰ مقام پر ایک عیسائی راہب "بحیرا" نے آپ کو دیکھ کر پہچان لیا کہ آپ ہی نبی آخر الزماں ہیں۔ اس نے آپ کو ان نشانیوں اور علامات سے پہچان لیا جو اس نے تورات و انجیل میں پڑھی تھیں۔ اس نے ابو طالب کو مشورہ دیا کہ ان کو آگے مت لے جاؤ یہودی ان کو قتل کر دیں گے، آپ یہیں سے واپس ہو جائیں چنانچہ ابو طالب نے اپنا مال فروخت کیا اور واپس آگئے۔

آپ کے بچپن کی طرح آپ کی جوانی بھی نہایت مقدس اور پاکیزہ تھی۔ نہ آپ نے بچپن میں کوئی ایسا کام کیا جو قابل اعتراض ہو یا کسی کے لیے تکلیف دہ ہو، نہ ہی جوانی میں آپ کسی چھوٹی سے چھوٹی برائی میں مبتلا ہوئے، حالانکہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسان جس ماحول میں پرورش پاتا ہے لازمی طور پر اس ماحول کا اثر اس میں آتا ہے، اس کے عادات و اخلاق اور زبان و بیان میں اس ماحول کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے مگر اس قدر گندے اور خراب ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اس ماحول کی کوئی خرابی آپ کے اندر نہ تھی۔ آپ نہایت روشن اور نورانی شکل و صورت کے تھے، نہایت سنجیدہ، رحم دل، انتہا درجہ کے خوش اخلاق، مہمان نواز، غریبوں کی مدد کرنے والے تھے، آپ کی قوم نے آپ کو صادق (سچا) اور امین (امانت دار) کا خطاب دیا تھا، آپ کی قوم آپ پر پورا پورا اعتماد رکھتی تھی اور آپ کے فیصلوں کو بڑی خوشی اور عزت کے ساتھ قبول کر لیتی تھی۔ آپ کی دیانتداری اور سچائی پر حضرت خدیجہ کا اعتماد ہی تو تھا جس کی وجہ سے انہوں نے آپ کو اپنا شریک تجارت بنا لیا اور آخر کار یہ اعتماد اس درجہ بڑھا کہ اپنا شریک زندگی بھی بنا لیا اور قوم کا آپ پر یہ ہی یقین اور اعتماد تو تھا جس سے آپ کے مدبرانہ فیصلہ سے ایک زبردست باہمی جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ جب تعمیر کعبہ کے موقع پر حجر اسود لگانے کا وقت آیا تلواریں کھنچ گئیں ہر قبیلہ کا سردار کہتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ سے لگاؤں گا، آخر فیصلہ اس پر ٹھہرا کہ کل صبح سب سے پہلے جو خانہ کعبہ میں داخل

ہو' وہی یہ پتھر لگائے گا۔ دوسرے دن صبح صبح سب سے پہلے جو خانہ کعبہ میں داخل ہوا وہ آپ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ تھی۔ سب لوگ یہ دیکھ کر خوش اور مطمئن ہو گئے لیکن آپ کا بہترین و بے مثال تدبر یہ تھا کہ آپ نے نہ صرف خود ہی حجرِ اسود دیوار میں لگایا بلکہ اپنے ساتھ سب کو شریک کر لیا' ایک چادر منگوائی' اس میں اپنے ہاتھ سے وہ پتھر رکھا اور تمام سرداروں سے کہا کہ سب مل کر اس چادر کو اٹھائیں اور جب پتھر دیوار کی اونچائی تک پہنچا آپ نے اٹھا کر لگا دیا۔ اس طرح اس اشرف کارنامہ میں سب سردار شریک ہو گئے۔ جنگ ٹل گئی' امن قائم ہو گیا اور سب خوش ہو گئے۔

بہتر معاشرہ قائم کرنے کے لیے آپ کی کوشش

آپ نے اپنے نبی ہونے کا اعلان چالیس سال کی عمر میں کیا لیکن اس سے پہلے آپ اپنی پوری زندگی اہلِ مکّہ اور عرب کی معاشرتی حالت کو بہتر بنانے میں صرف کرتے رہے۔ آپ نے ہر وہ کام کیا جس سے عربوں کو فائدہ پہنچے اور ان کی حالت میں سدھار پیدا ہو۔ بیس سال کی عمر میں آپ نے ایک ایسے معاہدہ میں شرکت فرمائی جس کا مقصد ملک میں امن و امان پیدا کرنا اور مکہ کے حالات کو بہتر بنانا تھا۔ اس معاہدہ کی دفعات یہ تھیں: (۱) ملک سے بدامنی دور کرنا' جنگوں کو روکنا۔ (۲) مسافروں کی حفاظت کرنا اور انہیں لُوٹ مار سے بچانا۔ (۳) غریبوں کی امداد کرنا۔ (۴) مظلوموں کی حمایت کرنا۔ (۵) کسی ظالم اور غاصب کو مکہ سے نکال دینا۔

آپ کی سماجی زندگی کیا تھی؟ اور آپ کا بہترین کردار کیا تھا؟ اس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ان جملوں سے روشنی پڑتی ہے جو انہوں نے آپ کے بارے میں اس وقت کہے جب آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلی بار وحی لے کر غار حراء میں آئے' آپ نے اس سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ آپ کو اس موقع پر اپنی زندگی کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا' اس کا اظہار آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کیا۔ حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے آپ سے جو کچھ کہا' وہ درحقیقت آپ کی پوری زندگی کے کردار اور آپ کے فکر کی

بلندیوں کا خلاصہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: "خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ رشتہ داروں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں، ان کا بار خود اٹھاتے ہیں، مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور مفلسوں کو کما کر کھلاتے ہیں۔"

حضرت خدیجہ سے نکاح

پچیس سال کی عمر مبارک میں آپ کا نکاح حضرت خدیجہ سے ہوا، اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی اور وہ بیوہ عورتوں میں سے تھیں۔ حضرت خدیجہ کی موجودگی میں آپ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ نکاح کے بعد حضرت خدیجہ پچیس سال حیات رہیں۔ پچیس سال کی نئی عمر میں آپ نے ایک چالیس سالہ بیوہ حضرت خدیجہ سے نکاح کرنا منظور کیا اور پھر اپنی عمر پچاس سال ہونے تک حضرت خدیجہ کی موجودگی میں کوئی دوسرا نکاح نہیں فرمایا، آپ کے اس عمل سے بیواؤں کا درجہ بلند ہوا اور اس سے ثابت ہوا کہ آپ ہوس رانی کا شکار نہیں تھے، اگر ایسا ہوتا تو نہ معلوم آپ اس نئی عمر میں کتنی عورتوں سے نکاح کر لیتے۔ آپ کی تمام اولادیں حضرت خدیجہ ہی سے ہوئیں سوائے ایک لڑکے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، جو حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ حضرت ماریہ قبطیہ آپ کی باندیوں میں سے تھیں جن کو شاہ مصر مقوقس نے آپ کی خدمت میں بطور ہبہ نذر کیا تھا۔ ان کی ماں رومی اور باپ مصری تھے۔

نزول وحی اور اعلان نبوت سے پہلے آپ کا کردار

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسی قوم میں پیدا فرمایا جو اخلاقی مذہبی اور معاشرتی ہر قسم کی بدترین برائیوں میں گرفتار تھی۔ کوئی گناہ ایسا نہ تھا جو ان کے یہاں علی الاعلان نہ ہوتا ہو۔ شرک و بُت پرستی کا یہ حال تھا کہ خانہ کعبہ مورتیوں کا مرکز تھا، اس میں ہر قبیلہ اور ہر خاندان کے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، ایسی بگڑی ہوئی بدترین اور جہالت

میں مبتلا قوم کی اصلاح و ہدایت کے لیے اور ایک صالح انقلاب اور بہترین تمدن پیدا کرنے کے لیے آپ کو نبی بنا کر بھیجا گیا اور برائی اور خرابی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ کو بہترین و صالح اور بے عیب کردار کی وہ قوت عطا فرمائی جو اصلاحی کام کرنے کے لیے ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی ہادی اور مصلح اگر قوم کے سامنے اپنا بے داغ کردار و عمل پیش نہ کرے تو قوم اس کی رہنمائی اور ہدایت کو کیسے قبول کرے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کی نبوت کا اعلان عام طور پر اسی وقت فرمایا جب ان کی عمر چالیس سال ہوگئی۔ اس میں مصلحت یہ ہی رہی کہ چالیس سال تک وہ اپنا صالح و بے داغ کردار قوم کے سامنے پیش کر کے ان کا اعتماد اور حسن اعتقاد حاصل کر لے۔ پھر اس اعتماد کے بعد وہ قوم کے سامنے رشد و ہدایت کی تبلیغ کرے اور ان کو شرک و کفر سے بچا کر معرفت الٰہی اور توحید باری تعالیٰ کی طرف بلائے تو قوم اسی اعتماد اور حسن عقیدت کے ساتھ نبی کی دعوت کو قبول کر لے۔

آپ نے بھی اعلانِ نبوت سے قبل چالیس سال تک اپنی قوم کے سامنے اعلیٰ درجہ کا کردار پیش کیا، اس بدترین معاشرہ کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ برائی اور خرابی آپ کے اندر نہ تھی۔ ایام طفولیت (بچپن) ہو یا عالمِ شباب، آپ کا کردار بہترین خوبیوں کا آئینہ دار رہا۔ تمام محاسن و کمالات آپ کے اندر موجود تھے۔ حیا و شرم، صداقت و دیانتداری، وعدہ کی پابندی، بزرگوں کی عظمت، چھوٹوں پر شفقت، رشتہ داروں سے محبت، رحم و سخاوت، قوم کی خدمت اور ہمدردی، دوستوں اور عزیزوں کی غم خواری، غریبوں اور مفلسوں کی مدد اور خبرگیری، دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک، اعلیٰ درجہ کی مہمان نوازی، مخلوق خدا کی خیر خواہی غرض تمام خوبیاں اور فضائل آپ میں اتنی بلندیوں پر تھے جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ سب سے زیادہ دکھ آپ کو اپنی قوم کی بت پرستی اور مورتی کی پوجا سے تھا، کیونکہ شرک اور بت پرستی انسان کو انسانیت سے گرا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نادانی و حماقت اور ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی خود ہی اپنے ہاتھ سے ایک مورتی بنائے جو بے حس و حرکت اور بے اختیار ہو اور پھر اسے اپنی ذات سے بلند سمجھے اور اسے اپنا معبود بنا کر اس کی پوجا شروع کر دے۔ حالانکہ وہ مورتی اپنے

وجود میں، اپنی حرکت میں، اپنے قائم ہونے میں، اپنے رنگ و روغن میں، غرض ہر چیز میں اسی پوجنے والے کی محتاج ہے۔ پھر وہ نہیں سمجھتا اور اس کی پوجا کرتا ہے۔ آپ کی خواہش تھی اور کوشش بھی کہ قوم اس بدترین برائی سے بچے۔ شرک نہ کرے۔ آپ نے جس طرح شرک سے بچ کر دکھلایا وہ بھی آپ کی عملی تعلیم اور کوشش تھی لیکن ابھی آپ کی نبوت کا اعلان نہ ہوا تھا اور آپ اپنے اعلیٰ اخلاق اور بہترین طریق زندگی اور حسن سلوک کے ساتھ خود کو قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ قوم نے آپ کی اس بے عیب اور خوبصورت زندگی کو دیکھا اور آپ کی عظمت و صداقت کو تسلیم کیا اور آپ کو صادق (سچا) اور امین (امانت دار) کا خطاب دیا۔

نزولِ وحی کا آغاز اور اعلان نبوت

جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال ہونے کے قریب پہنچی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے گوشہ تنہائی اختیار کیا اور آپ قریب کے ایک پہاڑ جس کو جبل حراء (حرا پہاڑ) کہتے ہیں، اس کے ایک غار میں اللہ کی عبادت کے لیے تشریف لے جانے لگے کیونکہ مکہ کی گناہوں سے بھری زندگی اور وہاں کا شور و شغب آپ کی عبادت میں حرج پیدا کرتا تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی عبادت کے لیے اس پر سکون جگہ کو پسند فرمایا۔ یہ غار پہاڑ میں تقریباً سو فٹ سے بھی زیادہ اونچائی پر ہے (آج بھی ہے) اور اس تک پہنچنے کا راستہ دشوار ہے۔ آپ اس غار میں کئی کئی دن رہتے جب آپ کا ناشتہ پانی ختم ہو جاتا تو آپ گھر آ کر پھر ناشتہ پانی لے جاتے، کبھی کبھی آپ کی بیوی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کو ناشتہ وہیں پہنچا آتیں۔

اس طرح کئی سال تک آپ گوشہ تنہائی میں بڑے سکون اور اطمینان سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے، جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنا فرشتہ جن کا نام جبرئیل علیہ السلام ہے، کو آپ کی خدمت میں وحی دے کر بھیجا اس وقت آپ غار حرا میں عبادت الٰہی میں مصروف تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام جو ہر نبی کے پاس اللہ کی وحی (پیغام) لے کر آتے رہے، وہی آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی

لائے۔ آپ کو سنائی اور پڑھائی، وہ پہلی وحی یہ تھی:

اقرا باسم ربک الذی خلق○ خلق الانسان من علق○ اقرا وربک الاکرم الذی علم بالقلم○ علم الانسان ما لم یعلم○	پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا فرمایا انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے، پڑھئے اور آپ کا رب نہایت کرم والا ہے، اس نے علم دیا قلم کے ذریعہ، سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آپ نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، وہ اچانک غار حرا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو قدرتی طور پر اس سنسان پہاڑ پر تنہائی کا عالم اور ایک نئی اور غیر مانوس شکل سامنے آئی، آپ کچھ گھبرائے اور کچھ خوف بھی محسوس ہوا لیکن یہ وحی جو جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے تھے وہ آپ کو یاد ہو گئی، اسی حالت میں آپ پہاڑ سے اترے، گھر تشریف لائے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ سے سب واقعہ بیان کیا۔ حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی اور دلاسہ دیا، پھر آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل، جو ایک عیسائی مذہب کے عالم تھے، کے پاس لے گئیں۔ جب انہوں نے یہ واقعہ سنا تو آپ کو نبوت ملنے کی خوشخبری سنائی اور فرمایا: یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لے کر آیا تھا۔ پھر فرمایا: کاش! میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمہاری قوم تمہیں مکہ سے نکال دے گی۔ آپ نے سوال کیا کہ کیا میری قوم مجھے مکہ سے نکال دے گی تو ورقہ نے بتلایا کہ "جو شخص بھی آپ کی طرح نبوت لے کر آیا قوم اس کی دشمن ہو گئی۔" اس کے بعد کچھ دنوں تک نزول وحی کا سلسلہ بند رہا، پھر کچھ دنوں کے بعد دوسری وحی نازل ہوئی:

یا ایھا المدثر○ قم فانذر○ وربک فکبر وثیابک فطھر والرجز فاھجر○	اے چادر اوڑھنے والے! کھڑے ہو جاؤ، پھر ڈر سناؤ اور اپنے رب کی بڑائی بولو اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور بتوں سے دُور رہو۔

ان آیات اور اس وحی کے نازل ہونے کے بعد آپ کو تبلیغ اسلام اور دعوت الی اللہ

یعنی لوگوں کو اللہ کو ایک جاننے، ماننے اور اسی کی عبادت کرنے کی طرف دعوت دینے کا حکم ہو گیا۔ تین سال تک آپ خاموشی اور رازداری کے ساتھ تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے، کچھ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ سابقین اولین یعنی سب سے پہلے ایمان لانے والے کہلاتے ہیں اور ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ تین سال کے بعد پھر وحی نازل ہوئی:

انذر عشیرتک الاقربین۔ اے محبوب! آپ اپنے خاندان والوں قرابت داروں کو خدا سے ڈرائیے۔

آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنے تمام رشتہ داروں کو جمع فرمایا اور ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور اللہ کو ایک ماننے کی دعوت دی۔ یہ سن کر تمام قریش آپ کے خلاف ہو گئے کہ یہ تو ہم سے ہمارا آبائی دین بت پرستی چھڑانا چاہتا ہے، اس طرح آپ کی مخالفت سخت ہو گئی۔ چوتھے سال وحی نازل ہوئی:

فاصدع بما تومر۔ تمہیں دعوت الی اللہ دینے کا جو حکم دیا گیا ہے، اسے علی الاعلان بیان کیجئے۔

آپ ﷺ کی نبوت کا اعلان ہو چکا تھا اور اب بالاعلان تبلیغ کا حکم آ گیا۔ آپ نے اسلام کی طرف اعلانیہ دعوت دینی شروع کی۔ دھیرے دھیرے لوگ اسلام کی طرف آنے لگے، شروع شروع میں کمزور لوگوں نے اسلام قبول کیا لیکن طاقت ور، زور آور، مغرور و متکبر لوگ زبردست مخالفت میں سامنے آئے اور آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بڑی بڑی اور سخت ترین ایذائیں اور تکلیفیں دینی شروع کر دیں۔ بڑی عجیب بات یہ ہے کہ وہ لوگ یعنی کفار مکہ یہ کہتے تھے "محمد ہم تمہیں جھوٹا نہیں کہتے لیکن تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے مان بھی نہیں سکتے۔" دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ آپ سچے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے، حق ہے، صحیح ہے لیکن ان کا غرور اور تکبر انہیں انکار کرنے پر مجبور کر رہا تھا، انہوں نے آپ کی شدید مخالفت کی۔ ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا آپ کے خلاف کیا۔ آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بے پناہ اور ناقابلِ برداشت تکلیفیں پہنچائیں، اس کے باوجود اسلام ترقی کرتا رہا۔ بدترین اور سخت ترین اذیت ناک ناقابلِ برداشت تکلیفوں کو بڑے عزم اور حوصلہ سے

برداشت کیا لیکن اسلام سے منہ نہ موڑا۔ (اس کا مظاہرہ مسلمان یہاں ہندوستان میں بھی ۱۹۴۷ء سے اب تک ۱۹۹۹ء تک کرتا آ رہا ہے۔) اور نہایت ثابت قدمی کے ساتھ تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ حضور پاک نبی برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کفار مکہ کا رویہ یہ تھا کہ ----

(۱) پہلے تو آپ کی تبلیغ کو قبول نہیں کیا۔ (۲) پھر آپ کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کیا کبھی آپ کو شاعر بتلایا، کبھی جادوگر کہا، کبھی مجنوں۔ (۳) اس کے بعد آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کیں۔ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے۔ (۴) کبھی آپ پر نجاستیں ڈالیں۔ (۵) کبھی آپ پر پتھر پھینکے کہ آپ کے پائے مبارک لہولہان ہو گئے۔ (۶) کبھی آپ کا بائیکاٹ کیا۔ (۷) کبھی آپ کو بادشاہ بنانے کا لالچ دیا لیکن کوئی چیز آپ کو تبلیغ اسلام اور دعوت الی اللہ سے نہ روک سکی۔ (۸) پھر انھوں نے اسلام کی ترقی روکنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کمزور اور غریب ایمان لانے والوں پر بہت سخت ظلم و ستم شروع کیے تاکہ نئے لوگ اسلام میں داخل نہ ہوں لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ آخر باہم مشورہ کرکے آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور خفیہ سازش سے آپ کا مکان رات میں گھیر لیا۔ آپ کو اللہ نے اس سے باخبر کر دیا۔ آپ نے ایک مٹھی خاک ان کی طرف کچھ پڑھ کر پھینکی، جس سے کافروں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور آپ ان کے درمیان ان کے سامنے سے گزر کر نکل گئے اور کافر آپ کو دیکھ نہ سکے۔

مدینہ کی طرف ہجرت

جب کفار مکہ کے ظلم و ستم حد سے زیادہ ہونے لگے اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانے کے نت نئے طریقے اختیار کرنے لگے۔ اس سے بھی ان کا دل نہیں بھرا تو انھوں نے مشترکہ منصوبہ آپ کو قتل کرنے کا بنایا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے کافروں کے منصوبہ قتل سے آپ کو باخبر کیا اور آپ کو ہجرت کرنے کی اجازت دی۔ یہ ہجرت مدینہ طیبہ کی طرف تھی اور بذات خود آپ نے کی اس موقع پر آپ کے انتہائی وفادار بچپن کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ یہ ہجرت اعلان نبوت کے ۱۳

سال بعد ہوئی لیکن اس سے بھی آٹھ سال پہلے اعلان نبوت کے پانچویں سال بھی ہجرت ہوئی، وہ ہجرت ملک حبشہ کی طرف تھی۔ اس میں آپ بذات خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ ان مسلمانوں کو حبشہ کی طرف جانے کی اجازت دی جن کا دین اسلام پر قائم رہنا اور دین پر عمل کرنا، عبادت کرنا۔ کفار مکہ نے اپنے بے پناہ ظلم و ستم اور نہایت درجہ ایذا رسانیوں سے ناممکن بنا دیا تھا، اس وقت ان لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، جن کی کل تعداد جو حبشہ پہنچی سو سے زیادہ تھی۔

حبشہ کا بادشاہ نجاشی عیسائی تھا۔ وہ مسلمانوں کی تبلیغ سے مسلمان ہو گیا اور اس نے مہاجروں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور اپنے ملک میں جگہ دی اور آرام سے رکھا۔ اس طرح اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر دوسرے ملک میں داخل ہو گیا لیکن حضور علیہ الصلوۃ والسلام ہجرت کے لیے اس مقام یعنی حبشہ سے مطمئن نہ تھے، آپ نے وقتی طور سے یہاں ہجرت کرنے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن آپ کی خواہش یہ تھی کہ مقام ہجرت جزیرۃ العرب اور حجاز کے علاقہ ہی میں ہو، حالانکہ حبشہ میں بادشاہ کے اسلام قبول کرنے اور حکومت کی حمایت کی وجہ سے مہاجرین نہایت محفوظ تھے مگر دو وجہ سے یہ جگہ مناسب نہ تھی:

(۱) ایک یہ کہ یہ جگہ دوسرے ملک میں واقع تھی۔ سمندر بیچ تھا، خشکی سے کوئی راستہ نہ تھا اس لیے مکہ کو فتح کرنا آسان نہ تھا اور وہاں سے مکہ والوں پر کوئی دباؤ بھی نہ پڑ سکتا تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ حبشہ کے باشندوں کی وہ خصوصیات نہ تھیں جو عربوں کی تھیں۔ عرب بہادر تھے، جفاکش تھے، صاحب عزم و ارادہ تھے، سفر کرنے میں راستوں کی دشواریوں سے گھبراتے نہ تھے، تلوار کے دھنی اور قول کے پکے اور بڑے مہمان نواز تھے۔ یہ تمام خصوصیات جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ اسلام کے لیے ضروری تھیں جو اہلِ حبشہ میں نہ تھیں۔ اس لیے آپ چاہتے تھے کہ ہجرت کا مقام کہیں حجاز کے علاقہ ہی میں ہو۔

آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی مراد پوری فرما دی۔ مدینہ جس کا پرانا نام یثرب تھا، وہاں سے کچھ لوگ آ کر داخل اسلام ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کو اور آپ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور آپ کی حمایت کا یقین دلایا لیکن آپ نے بنفس نفیس ہجرت اس

وقت تک نہ کی جب تک آپ کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہوا اور کافروں نے متحد ہو کر قتل کرنے کے لیے آپ کے گھر کو رات میں نہ گھیر لیا اور جب تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کی اجازت نہ دے دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت دو وجہ سے کی جا سکتی ہے:

(۱) جان کے خطرہ سے۔

(۲) اور دین پر عمل کرنے سے روکنے پر۔

حبشہ کی طرف ہجرت دوسری وجہ سے ہوئی اور مدینہ کی طرف ہجرت آپ نے پہلی وجہ سے کی یعنی جان کے خطرہ میں ہونے کی وجہ سے۔

مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت اعلانِ نبوت کے تیرہویں سال ہوئی۔ جب آپ مدینہ طیبہ پہنچے اس وقت تک وہاں بہت سے مسلمان پہنچ چکے تھے اور مدینہ کے بھی بہت سے باشندے اسلام قبول کر چکے تھے جن کا تعلق وہاں کے قبیلے اوس اور خزرج سے تھا۔ ان سب نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ یہاں پہنچ کر آپ کو اور مسلمانوں کو اپنی جان و مال کا تحفظ حاصل ہوا اور اطمینان سے اپنے دین و مذہب کے احکام پر عمل کرنے کا موقع ملا اور مدینہ پہنچ کر قرآنی معاشرت اور قرآنی تہذیب و تمدن کی اصل بنیاد پڑی۔

مدینہ کا پرانا نام یثرب تھا جس کے معنی ہیں "ویرانہ" کیونکہ اس آبادی میں بیماریاں بہت پھیلتی تھیں، اس لیے نئے آنے والے یہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس کو ویرانہ کہتے تھے۔ آپ کے یہاں تشریف لانے کے بعد آپ کی برکت سے یہاں کی بیماریاں ختم ہو گئیں اور اس کا نام مدینہ ہو گیا جس کے معنی ہیں "شہر۔"

مسجد کی تعمیر اور یہودیوں سے معاہدے

یہاں تشریف لانے کے بعد آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد تعمیر کی کیونکہ یہ مسلمانوں کی اولین ضرورت تھی تاکہ وہ اس میں نماز پڑھیں اور اپنی عبادت کریں۔ دوسرا کام آپ نے مدینہ میں رہنے والے یہودی قبیلوں بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی قریظہ سے معاہدۂ امن کیا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ مہاجرین یعنی باہر سے آنے والوں اور مقامی باشندوں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ان کے درمیان مواخاۃ یعنی بھائی بھائی ہونے کا

رشتہ قائم فرمایا تاکہ ان کے درمیان اجنبیت نہ رہے اور یہ سب ایک ہی خاندان کی طرح رہیں اور دوسری طرف یہودی بھی مطمئن رہیں اور اپنے لیے کوئی خطرہ اور نقصان محسوس نہ کریں اور کفار مکہ سے سازباز نہ کریں۔

اس سے پہلے ہم آپ کی تبلیغ و تعلیم اور آپ کے اصلاح معاشرہ کی کوششوں کے بارے میں بتلائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ذات مقدسہ اور آپ کے فضائل و معجزات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیں تاکہ آپ کے اعلیٰ مقام اور بے مثال ذات و صفات کا کچھ تصور ذہن میں آجائے۔

آپ کے فضائل و معجزات

اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ حسن کا دلدادہ اور متوالا ہے انسان ہو یا غیر انسان، وہ ہر شے میں حسن تلاش کرتا ہے اور اسی چیز کی طرف راغب ہوتا ہے جس میں حسن ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر طرف حسن ہی حسن بکھیر دیا ہے۔ حدیث شریف ہے: "اللہ جمیل ویحب الجمال" اللہ کی ذات جمیل ہے اور وہ جمال ہی کو پسند فرماتا ہے کیونکہ اللہ نور ہے اور نور تو حسن ہی حسن ہے۔ اس نے دنیا میں بڑی بڑی حسین و جمیل چیزیں پیدا فرمائیں اور اپنے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ حسین بنادیا آپ کو جمال صورت بھی عطا فرمایا اور جمال سیرت بھی، تاکہ لوگ آپ کی طرف رغبت کریں اور آپ کی دعوت الی اللہ کو قبول کریں۔ آپ کو دیکھنے والے اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کرام آپ کے جمال صورت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

آپ کا حلیہ مبارک

اپنے جسم مبارک کی ساخت اور اعضاء کے تناسب میں اور اپنے حسن و جمال میں آپ بے مثل و بے مثال ہیں۔ صحابہ کرام اور سیرت نگاروں نے آپ کے ہر عضو کی تصویر کشی کی ہے۔

آپ کا جسم اطہر

آپ کا رنگ گورا سپید تھا' نہایت نرم نازک تھا' جسم مبارک سے خوشبو نکلتی تھی۔ آپ کے جسم پر کبھی مکھی نہیں بیٹھتی تھی بلکہ اس کپڑے پر بھی نہیں بیٹھی جسے آپ پہنتے یا اوڑھتے تھے۔

آپ کا قد مبارک

آپ کے جسم مبارک کا سایہ نہ تھا۔ قد مبارک نہ زیادہ لمبا تھا' نہ آپ پستہ قد تھے لیکن جب آپ مجمع میں چلتے سب سے بلند معلوم ہوتے تھے۔ سر مبارک آپ کا بڑا تھا' آپ کے بال نہ گھنگریالے تھے' نہ بالکل سیدھے' آپ کے سر مبارک کے بال کبھی کانوں کی لو تک ہوتے' کبھی ذرا اور بڑے شانوں تک ہوتے۔ آپ کا رخ انور نہایت درجہ روشن اور تاباں تھا۔ نہایت وجیہ' پُر گوشت اور تقریباً بیضاوی یعنی نہ بالکل گول نہ لمبا' اس قدر نورانی کہ چاندنی رات میں چاند بھی آپ کے چہرہ کے نُور میں تیرتا ہوا محسوس ہوتا تھا' آپ کی بھنویں لمبی گھنی اور باریک تھیں' دونوں بھویں اتنی قریب تھیں کہ دور سے ملی ہوئی محسوس ہوتی تھیں' ان دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھر جاتی تھی۔

آپ کی آنکھیں

چشم مبارک آپ کی بڑی بڑی اور نہایت متناسب اور سرگیں تھیں' پلکیں گھنی اور دراز پتلی نہایت سیاہ اور آنکھ کی سپیدی خوب سپید تھی جن میں باریک باریک سرخ ڈورے تھے۔

آپ کی بینی مبارک

آپ کی ناک نہایت خوبصورت دراز اور بلند تھی جس میں نور جھلکتا تھا۔

آپ کی مقدس پیشانی

آپ کی پیشانی نہایت کشادہ اور چوڑی تھی اور اس پر ایک نور جھلکتا تھا۔ آپ کے گوش مبارک کی بھی ایک معجزانہ شان تھی، نہایت متوازن اور خوش وضع آپ کو دیکھنے اور سننے کی زبردست قوت عطا فرمائی گئی تھی۔ دور و قریب کی چیزیں آپ کی نگاہ کے سامنے رہتی تھیں، اسی طرح دور و قریب کی آوازیں آپ یکساں سن لیتے تھے۔ مدینہ کے یہودی اور منافق آپ کو اذن کہتے تھے، یعنی یہ کہ آپ کی قوت سماعت بہت زیادہ تھی اس لیے آپ کے لیے وہ کان ہونے کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

آپ کا دہن شریف یعنی دہانہ (منہ) فراخ، دانت کشادہ اور روشن تھے۔ جب آپ گفتگو فرماتے تو سامنے کے دانتوں سے نور نکلتا تھا اور جب آپ کبھی اندھیرے میں مسکراتے دندان مبارک کے نظر آنے سے روشنی ہو جاتی تھی۔

زبان اقدس

آپ کی زبان اقدس کی کیفیت عجیب تھی۔ وہ وحی الٰہی کی ترجمان، فصاحت و بلاغت سے بھری گفتگو فرماتے جس کو سن کر عرب کے بڑے بڑے ادیب و خطیب، فصاحت و بلاغت کے ماہر حیران رہ جاتے۔ آپ شیریں سخن اور نرم گفتار تھے۔

آپ کی آواز مبارک

آپ نہایت خوش گو اور خوش آواز تھے۔ آپ کی آواز کی یہ خصوصیت تھی کہ دور و قریب سے یکساں سنائی دیتی تھی۔ نہایت شیریں نہایت دل میں اثر کرنے والی۔ آپ کی گردن مبارک نہایت معتدل صراحی دار نہایت سڈول خوبصورت اور چاندی کی طرح صاف و شفاف۔ آپ کے دست مبارک کی ہتھیلیاں اتنی نرم و نازک تھیں کہ مصافحہ کرنے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ریشم ہاتھ میں لے لیا۔ ہتھیلیوں سے بھی خوشبو نکلتی تھی۔ جو آپ سے مصافحہ کرتا اس کے ہاتھ خوشبو میں بس جاتے۔ آپ کا شکم

اور سینہ دونوں ہموار اور ایک ہی سطح میں تھے، نہ سینہ اونچا تھا نہ شکم سینہ سے نکلا ہوا۔ پائے اقدس آپ کے چوڑے اور پرُ گوشت تھے، ایڑیاں کم گوشت والی، تلوا اونچا زمین سے نہ لگتا تھا، دونوں پنڈلیاں قدرے پتلی، سڈول، صاف اور شفاف اور چکنی جن پر پانی نہیں رکتا تھا۔

یہ تمام تفصیلات احادیث میں بیان کی گئی ہیں خاص طور سے ترمذی شریف میں جو حدیث کی ایک مستند کتاب ہے اس میں پوری تفصیل سے آپ کا حلیہ مبارک لکھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے صحابہ نے آپ کی ہر چیز کو پوری احتیاط اور دیانتداری سے بیان کیا ہے۔ آپ کا کلام، آپ کے اخلاق و عادات، آپ کے معمولات، آپ کی عبادات، آپ کی خانگی زندگی، آپ کا لباس، آپ کی خوراک، آپ کا سونا اور جاگنا، چلنا پھرنا، غرض کہ ایک ایک چیز کو بغور دیکھا اس کو بیان کیا اور آپ کی اتباع و پیروی کی کوشش کی۔ یہ صحابہ کرام کی اس محبت کا ثبوت ہے جو انہیں آپ کے ساتھ تھی۔

آپ کے فضائل و معجزات

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام دنیا کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجا اور آپ کو ساری دنیا کی ہدایت اور اصلاح کا منصب عطا فرمایا۔ آپ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام جن و انسانوں کی ہدایت کے لیے تشریف لائے تاکہ دنیا کو توحید الٰہی کا سبق دیں۔ کفر و شرک اور ظلم و جبر سے روکیں اور عادلانہ و منصفانہ صاف و شفاف معاشرہ قائم فرمائیں۔ آپ کی نبوت و رسالت کسی محدود علاقہ بالخصوص قوم کے لیے نہیں، ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی عظیم ذمہ داری ہے، ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے عظیم حوصلہ، عظیم قوت اور عظیم صلاحیتوں اور قابلیتوں کی ضرورت ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ تمام فضائل و کمالات، معجزات کی قوتیں اور مخالفتوں کی شدت برداشت کر کے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنے مقصد کو پورا کرنے کی قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائیں۔ اس سے بڑا اور اہم کام آپ سے پہلے کسی نبی اور رسول کو عطا نہیں ہوا، اس لیے ان کو وہ صلاحیتیں اور قابلیتیں اور وہ معجزات اور وہ قوتیں بھی عطا نہیں ہوئیں جو آپ کو عطا کی گئیں۔ قرآن

پاک میں جگہ جگہ آپ کے فضائل کو بیان کیا گیا ہے اور ان نعمتوں، قوتوں اور معجزات کا ذکر ہے جو آپ کو اپنے منصب رسالت کی ذمہ داری پورا کرنے کے لیے ضروری تھے۔ قرآن پاک میں بڑی عظمت و اہمیت کے ساتھ آپ کی بعثت و رسالت یعنی آپ کے نبی اور رسول ہونے کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ (سبا: ۲۸)

اور اے محبوب! ہم نے آپ کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

ایک دوسری جگہ سورۂ اعراف میں فرمایا:

(۲) قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ (الاعراف: ۱۵۸)

تم فرماؤ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۹ پارہ ۱ میں فرمایا:

(۳) انا ارسلنک بالحق بشیرا و نذیرا ولا تسئل عن اصحاب الجحیم۔

بے شک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا۔

سورہ فرقان کی پہلی ہی آیت میں فرمایا:

(۴) تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا۔

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اتارا قرآن اپنے بندہ پر جو سارے جہان کو ڈر سنانے والا ہے۔

سورہ فتح پارہ ۲۶ آیت ۸، ۹ میں فرمایا:

(۵) انا ارسلناک شاھدا و مبشرا و نذیرا لتومنوا باللہ ورسولہ وتعزروہ وتوقروہ۔

بے شک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر و ناظر، خوشی اور ڈر سناتا تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور

رسول کی تعظیم و توقیر کرو۔

سورۂ انبیاء پارہ ۱۷ آیت ۱۰۷ میں ہے:

(۶) وما ارسلنک الا رحمہ للعالمین۔ — (اے محبوب) ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر سارے جہان کے لیے رحمت۔

سورۂ احزاب آیت ۴۰ پارہ ۲۲ میں اعلان فرمایا:

(۷) ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شیی علیما۔ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، ہاں! اللہ کے رسول اور سب نبیوں کے لیے (آخری) اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

پانچویں پارہ سورہ نساء آیت ۱۷۵ میں فرمایا:

(۸) یا ایھا الناس قد جاء کم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نورا مبینا۔ — اے لوگو! بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل آئی اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور اتارا۔

سورہ فتح پارہ ۲۶ آیت ۲۸ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۹) ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شھیدا۔ — (اللہ) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو سچے دین اور ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے اور اللہ کافی ہے گواہ۔

پارہ ۴ سورہ آل عمران آیت ۱۶۴ میں فرمایا:

(۱۰) لقد من علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمہ وان کانوا — بے شک اللہ کا بڑا احسان ہے مسلمانوں پر کہ انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے

من قبل لفی ضلال مبین۔ — کھلی گمراہی میں تھے۔

سورہ جمعہ میں بھی تقریباً اسی مضمون کی آیت ہے فرمایا:

(۱۱) هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمه وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (الجمعہ: ۲)	وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کا علم عطا فرماتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔

اکیسویں پارہ میں سورہ احزاب کی آیت اکیس میں فرمایا:

(۱۲) لقد کان لکم فی رسول الله اسوه حسنه لمن کان یرجو الله والیوم الاخر و ذکر الله کثیرا۔	بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے اس کے لیے کہ اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے۔

سورہ آل عمران تیسرا پارہ آیت ۳۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱۳) قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم والله غفور رحیم۔	اے محبوب! تم فرما دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار بن جاؤ، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

پارہ ۳۰ سورۂ تکویر آیت ۲۲ تا ۲۴ میں فرمایا:

(۱۴) وما صاحبکم بمجنون ○ ولقد راه بالافق المبین ○ وما هو علی الغیب بضنین ○	اور تمہارے صاحب مجنون نہیں، بے شک انہوں نے روشن کنارے پر دیکھا اور یہ نبی غیب بتانے پر بخیل نہیں۔

سورۃ الضحیٰ پارہ ۳۰ آیت ۵ میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا:

(۱۵) ولسوف یعطیک ربک فترضی۔ ۔ بے شک تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔

اور فرمایا:

(۱۶) ورفعنا لک ذکرک۔ ہم نے تمہارا ذکر بلند فرمادیا۔

(الانشراح، پارہ ۳۰)

اور یہ آیت بڑی جامع اور وسیع المفہوم ہے، آپ کے تمام فضائل و کمالات، معجزات اور صفات اس میں شامل ہیں، اس کی تشریح و تفسیر اور تفصیل ممکن نہیں۔ آپ کے فضائل اور آپ کی عظمت بیان کرنے کے لیے قرآن پاک میں بکثرت آیات ہیں ان میں سے ہم نے صرف سولہ آیات معہ ترجمہ بیان کی ہیں اور ان کی تشریح و تفسیر بیان نہیں کی، کیونکہ ان کی تشریح و تفسیر کے لیے ضخیم جلدوں کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ اندازہ تو ضرور ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت کے ساتھ آپ کو کتنی عظمتیں اور رفعتیں عطا کی ہیں، مزید علم کے لیے قرآن پاک کا مطالعہ کرنا چاہیے اور آپ کے فضائل کی کتابوں اور سیرت نگاروں کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

آپ کے معجزات اور آپ کی رُوحانی قوتیں

ہم نے گزشتہ صفحات میں بتلایا تھا کہ منصب رسالت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے جن قوتوں اور قابلیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب ہی اعلیٰ پیمانہ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائیں۔ حسن صورت، حسن سیرت، حسن اخلاق، حسن کردار، حسن گفتار۔ نقص اور عیب خواہ جسمانی ہو یا اخلاقی، عقائد و افکار میں ہو یا کردار و عمل میں اس سے پاک و صاف ہونا، ہر گناہ سے محفوظ ہونا یہ تمام قوتیں ایک نبی، ایک رسول اور ایک ہادی برحق میں ہونا ضروری ہیں، ان کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ روحانی قوتیں اور معجزات کی قوتیں بھی عطا فرماتا ہے۔ وہ ایسی عجیب چیزیں کر کے دکھلاتا ہے جو مافوق الفطرت ہوتی ہیں جنہیں کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا، ان ہی کو معجزات کہتے ہیں۔ یہ معجزات اور روحانی قوتیں انبیاء کی صداقت اور ان کے دعوائے نبوت، ہادی الی الحق اور

داعی الی اللہ ہونے کا ثبوت ہوتی ہیں۔ یہ معجزات ہر نبی کو عطا کیے گئے لیکن ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار معجزات عطا فرمائے اور آپ کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام کائنات و مخلوق سے افضل کیا کیونکہ آپ کی نبوت سب کے لیے تھی اور ہے اور قیامت تک رہے گی۔ اس لیے آپ کا سب سے افضل ہونا اور اعلیٰ ہونا ضروری ہے۔ آپ کے وہ معجزات جو صرف آپ ہی کی ذات مقدسہ کے ساتھ مخصوص ہیں جو دیگر انبیاء کو نہیں ملے، وہ آپ کے خصائص کہلاتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ محققین نے انہیں بیان کرنے کی کوشش کی مگر پورے پورے بیان نہ کر سکے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے آپ کے مخصوص معجزات "خصائص کبریٰ" کے نام سے بیان کرنے چاہے مگر وہ سو دو سو سے کچھ ہی زیادہ بیان کر سکے۔ اس جگہ ہم ضرورت کے لحاظ سے کچھ (معدودے چند) معجزات و فضائل بیان کریں گے جن سے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہو گا کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنی قدرت سے آپ کو کیا کیا معجزات اور کیسی کیسی قوتیں عطا فرمائیں تھیں۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ آپ کو مغلوب کر سکی نہ مرعوب۔ آپ ہی سب پر غالب رہے اور آخر کار آپ نے وہ تمام مقاصد حاصل کر لیے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا تھا اور ایک صالح، منصفانہ کفر شرک سے پاک و صاف اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری اور صرف اسی کی عبادت کرنے والا ایک نیا معاشرہ اور نیا تمدن قائم فرما دیا۔ الحمد للہ تعالیٰ۔

آپ کے فضائل و معجزات میں سے بہ قدر ضرورت یہاں بیان کیے جا رہے ہیں:

(۱) آپ کا سب سے اہم اور عظیم معجزہ قرآن پاک جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور اس کا کلام ہے اس کی خصوصیات اور عظمتیں مختصراً ہم بعد میں بیان کریں گے یہ آپ کا معجزہ ہی نہیں بلکہ اس میں اسلام کی وہ تمام تعلیمات ہیں جنہوں نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا اور دنیا کو فلاح و نجات اور رشد و ہدایت کا راستہ دکھلایا آئندہ سطور میں ہم اس کا ذکر کریں گے۔

(۲) ایک عظیم اور خاص معجزہ آپ کا شق القمر ہے (یعنی چاند کے ٹکڑے کرنا) یہ معجزہ آپ نے اس وقت دکھلایا جب کفار مکہ نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اگر آپ چاند کے

دو ٹکڑے کر دیں تو ہم آپ کا نبی ہونا تسلیم کر لیں گے اور آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ چودھویں رات کا پورا چاند تھا آپ نے اپنی مبارک انگلی سے اشارہ فرمایا اور چاند دو برابر حصوں میں تقسیم ہو کر دور دور ہو گیا لیکن وہ کافر پھر بھی ایمان نہ لائے بلکہ یہ الزام دے کر انکار کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کر دیا۔ چاند کا ٹکڑے ہونا ان تمام علاقوں میں دیکھا گیا جہاں جہاں رات تھی اور چاند نکلا ہوا تھا' بادلوں میں چھپا ہوا نہ تھا اور جو چاند کی طرف اس وقت دیکھ رہے تھے۔

(۳) ایک اور خاص معجزہ آپ کا ڈوبتے سورج کو پلٹا دینا ہے جو خیبر کے قریب منزل صہباء میں قیام کے دوران پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملے گی۔

(۴) آپ نے مکہ کے کافروں کی مٹھی میں بند کنکریوں کو کلمہ پڑھوا دیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار مکہ کے کافر مٹھی بھر کنکریاں لے کر مٹھی بند کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اگر آپ یہ بتلا دیں کہ ہماری مٹھی میں کیا ہے؟ تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے' آپ نے فرمایا کہ میں بتلا دوں کہ تمہاری مٹھی میں کیا چیز ہے یا وہ چیز جو تمہاری مٹھی میں ہے وہ بتلا دے کہ میں کون ہوں؟ کافر بہت حیران ہوئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کنکریاں تو بولتی نہیں ہیں۔ وہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اس فرمان پر راضی ہوئے۔ آپ نے فرمایا: دیکھو اور سنو! یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ انہوں نے مٹھی کھولی تو سنا کہ کنکریاں پڑھ رہی ہیں "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" یہ سن کر کافر حیران ہوئے' پھر بھی ایمان نہ لائے اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کر دیا۔"

(۵) آپ کا ایک عظیم' اہم اور خاص معجزہ معراج شریف ہے۔ آپ رات کے چھوٹے سے حصہ میں مکہ معظمہ میں واقع مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے گئے پھر وہاں سے سلسلہ وار ساتوں آسمانوں سے گزرے' پھر وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک سفر فرمایا' یہاں سے آگے جانے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے' جو یہاں تک آپ کے ساتھ تھے' معذوری ظاہر کی اور آپ تن تنہا عرش اعظم تک قرب الٰہی میں داخل ہوئے جہاں آپ کو اپنے رب کا دیدار حاصل ہوا۔ رب تبارک و تعالیٰ نے آپ سے بے

حجاب کلام فرمایا۔ اسی موقع پر آپ کو اس انعام اور تحفہ سے نوازا:(۱) سورہ بقرہ کی آخری آیتیں عطا فرمائیں۔ (۲) اور یہ خوشخبری دی کہ آپ کی امت کا ہر وہ شخص جس نے شرک نہ کیا ہو بخش دیا جائے گا (یعنی جس نے اللہ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک نہ کیا ہو) (۳) تیسرا انعام یہ عطا فرمایا کہ آپ کی امت کو پچاس وقت کی نمازیں عطا ہوئیں جو بعد میں کم کر کے دن رات چوبیس گھنٹہ میں صرف پانچ کر دیں اور ان کا ثواب پچاس ہی کے برابر رکھا۔ اسی سفر میں آپ نے جنت دوزخ کی سیر فرمائی اور آسمانوں پر اولوالعزم انبیاء سے ملاقات بھی کی، پھر آپ واپس بیت المقدس سے ہوتے ہوئے مکہ معظمہ تشریف لائے اور ابھی رات کا تھوڑا سا حصہ بھی نہ گزر پایا تھا۔

(۶) چونکہ آپ تمام عالم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے اس لیے پہاڑ، پتھر، درخت، جانور سب ہی آپ کو یا رسول اللہ کہہ کر سلام کرتے، کلام کرتے اور اپنا دکھ درد بیان کر کے اس کو دور کرواتے تھے۔ اونٹ، ہرنی، چڑیا کی شکایات کا بیان، پتھروں کا سلام کرنا اور کنکریوں کا کلمہ پڑھنے کا واقعہ مشہور ہے اور احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔

(۷) آپ کی انگشت مبارک سے تیرہ مواقع پر پانی کی نہریں جاری ہوئیں۔ یہ محدثین کرام کی تحقیق ہے۔ ۶ھ میں جب آپ بغرض عمرہ مکہ معظمہ تشریف لا رہے تھے اس وقت پندرہ سو صحابہ کرام آپ کے ساتھ تھے مقام حدیبیہ پر پڑاؤ کیا تو حدیبیہ کا کنواں پانی نکالنے کی وجہ سے خشک ہو گیا چونکہ اس میں پانی کم تھا، لوگ ایک ایک قطرہ پانی کے لیے محتاج ہو گئے۔ اس کی شکایت حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے دربار میں کی گئی۔ آپ کا دریائے رحمت جوش میں آیا، آپ نے ایک بڑے پیالے میں اپنا دست مبارک رکھ دیا تو آپ کی انگلیوں سے پانی فوارے کی طرح ابلنے لگا۔ تمام صحابہ نے سیر ہو کر پانی پیا، اپنے مشکیزوں اور برتنوں میں پانی بھر لیا، پھر آپ نے اپنا دست مبارک پیالے سے ہٹا لیا۔

(۸) آپ کا ایک معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ تمام قوتیں اور طاقتیں بدرجہ کمال عطا فرمائی تھیں جو ایک ہادی اور مصلح کو قوم کی اصلاح اور رشد ہدایت کے لیے ضروری ہیں۔ آپ کے زمانہ مبارکہ میں عرب کے قرب و جوار میں روم و فارس کی دو مضبوط حکومتیں تھیں لیکن ان میں کفر و شرک، بد عقیدگی، گناہ و معصیت، بد عملی اور

معاشرہ کو تباہ کرنے والی ساری خرابیاں موجود تھیں، ان کا تمدن بھی مظالم و مفاسد سے بھرا ہوا تھا، اس سے بھی زیادہ خراب اور بگڑی ہوئی حالت عرب قوم کی تھی، ان میں نہ تو کوئی حکومت تھی نہ کوئی نظم و قانون، ایک آزاد اور بے قید زندگی جس میں گناہ و معصیت، قتل و خونریزی اور ظلم و جبر کوئی عیب نہ تھا۔ وہ بدترین شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے، ان کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ نہ وہ کسی قیمت پر اپنے آبائی مشرکانہ دین کو چھوڑنے اور اپنی بدترین خرابیوں کی اصلاح کے لیے تیار تھے نہ ہی ان کو اپنی ذلت و خواری کا احساس تھا۔ وہ اپنی جہالت، خونریزی اور بے رحم و بے لگام معاشرہ پر فخر کرتے تھے۔ آپ نے ایسی بدترین قوم جس کے اردگرد بھی انسانیت کا نام و نشان نہ تھا، کو صرف اور صرف تئیس سال کے قلیل عرصہ میں نہ صرف بدل دیا اور نہ صرف ان کی ہمہ جہت اصلاح فرمائی، بلکہ تمام دنیا کی تہذیب و تمدن سے آشنا کیا۔ پورے ملک میں امن امان اور عدل و انصاف اور مساوات قائم ہو گئی اور نظم و نسق اور قانون کی پابندی کی جانے لگی۔

وہی عرب جو جاہل اور وحشی تھے صرف ۲۳ سال کی چھوٹی سی مدت میں روشنی کا ایک مینارہ بن گئے اور دنیا ان کی تہذیب و تمدن کی مثال دینے لگی۔ یقیناً یہ رسول پاک علیہ الصلوۃ والسلام کا ایک زبردست معجزہ ہے، مخالفین اسلام سیرت نگار بھی آپ کے اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے انکار تو کر نہیں سکتے مگر آپ پر ایمان لانے کو تیار نہیں ہوتے، یہ کچھ ایسی ہی عجیب بات ہے جیسی مکہ کے کافر ایمان لانے سے پہلے کہا کرتے تھے کہ "اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم تمہیں جھوٹا نہیں کہتے لیکن تم جو کچھ کہتے ہو اسے مان بھی نہیں سکتے"۔۔۔۔۔ اگر دنیا انصاف پسند ہو تو آپ پر ایمان لانے، اسلام قبول کرنے کے لیے آپ کا یہ عظیم معجزہ کافی ہے کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی نہ ہوتے اور آپ کی مدد اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہ ہوتی تو اتنی چھوٹی سی مدت میں اتنا بڑا کام ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی ماضی میں کوئی مثال ہے نہ مستقبل میں کوئی ایسی امید، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے اور ایمان کی دولت عطا فرما دیتا ہے۔

قرآن مجید کی خصوصیات

(۱) قرآن پاک ایک عظیم آسمانی کتاب ہے جو حق کے ساتھ نازل ہوئی اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ (۲) چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اب مخالفین اسلام اور معترضین کے نزدیک بھی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ قرآن پاک ایک ایسی مقدس کتاب ہے جس کی کوئی مثال نہ قرون ماضیہ میں ملتی ہے اور نہ قرون آئندہ میں اس کی کوئی نظیر ممکن ہے۔ ۔ یوں طول و طویل زمانہ گزرنے کے باوجود اس کتاب کا ہر قسم کی تبدیل و تحریف سے محفوظ رہنا خاص طور سے اس چیلنج اور اعلان کے ساتھ کہ یہ کتاب محفوظ ہی رہے گی، اس میں کوئی بھی تبدیلی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ ہم ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کر رہے ہیں اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

ان چودہ سو سال کی مسلسل و معلوم تاریخ میں اس کا ایک لفظ ایک حرف یا ایک نقطہ بھی کوئی تبدیل نہ کر سکا یہ بات اس کتاب کے حق ہونے کا ایسا مضبوط ثبوت ہے جس کا انکار کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ (۳) پھر یہ قرآن مجید کی خواہ یہ حیثیت سامنے رکھی جائے کہ یہ ایک محفوظ کتاب ہے یا اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ کوئی بڑے سے بڑا عربی ادب کا ماہر اس کی مثل ایک چھوٹے سے چھوٹا جملہ بنا کر بھی پیش نہ کر سکا حالانکہ قرآن نے دنیا کے تمام نہ ماننے والوں کو بالاعلان چیلنج بھی دیا اور ساتھ ہی ان کے عاجز رہنے کی خبر بھی سنادی۔ اور خواہ قرآن پاک کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ یہ:

(۴) تبیانا لکل شیی۔ اس میں کائنات کی ہر شے کا بیان ہے۔

جس میں انسانی معاشرے کے لیے قیامت تک پیش آنے والی تمام ضرورتوں کا حل موجود ہے۔ اور انسانی زندگی کے ہر دور کے لیے کامل ہدایات اور احکام موجود ہیں صاحبِ بصیرت و بصارت اور صاحبِ علم و فضل اور صاحب معرفت ہی قرآن سے جملہ احکام معلوم کر سکتے ہیں، لیکن بے علم و بے یقین اور اندھی عقل والوں کو اس میں کیا

نظر آئے گا۔

آنکھ والا تیری قدرت کا تماشہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

(۵) اور خواہ قرآن پاک کو اس کی قوت تاثیر کے لحاظ سے دیکھا جائے۔ (۶) یا اس کا حسین و دلکش اور سادہ پروقار انداز بیان سامنے رکھا جائے' (۷) یا اس کے طرز استدلال پر نگاہ ڈالی جائے' (۸) یا اس کے احکام و بیان احکام کو دیکھا جائے' (۹) یا علوم قرآن یا اس میں تعداد علوم کو دیکھا جائے' (۱۰) یا اس کے مفسرین کی تعداد اور ان کی لکھی ہوئی تفسیروں کی تعداد کا شمار کیا جائے' (۱۱) یا اس کے شمار میں آنے والے حفاظ کو گنا جائے۔ (۱۲) اور اس کی تعلیم و تدریس۔ (۱۳) اس کی کتابت کے حسن۔ (۱۴) اور اس کی اپنی مخصوص کتابت کی تکنیک' (۱۵) یا اس کے معجزات جو چھ ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ (۱۶) یا اس کی اخبار غیبیہ' (۱۷) یا اس کا نظم عبارت۔ (۱۸) اور اس کا اعجاز بیان' (۱۹) یا مسلمانوں کا اس سے عشق و شغف' (۲۰) اس کی تجوید و قرأت اور (۲۱) یا اس کے اجزاء کی تقسیم آیات' رکوع' سورہ اور پاروں میں' (۲۲) اس کی آیات کا شمار' (۲۳) اس کی سورتوں کا شمار' (۲۳) ان سورتوں میں تعداد الفاظ' (۲۴) تعداد حرف۔ (۲۵) تعداد زیر و زبر اور پیش۔ بہرحال کسی بھی حیثیت اور نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے قرآن پاک بے مثل و بے نظیر ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر وہ حدیث بیان کی جائے جو حضرت حارث اعور تابعی نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے بذات خود حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے سنا کہ آپ فرماتے ہیں کہ عنقریب ایک فتنہ آئے گا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (ﷺ) اس فتنہ سے نکلنے (نجات پانے) کی کیا صورت ہوگی؟ آپ نے ارشاد فرمایا: (اس سے بچ نکلنے کی صورت ہے) کتاب اللہ (کیونکہ) اس میں تم سے پہلے (یعنی تمام امم ماضیہ) کی خبریں ہیں اور تم سے بعد آنے والے لوگوں کے اخبار و حالات (یعنی غیبی پیشین گوئیاں) بھی ہیں اور تمہارے باہمی معاملات و مسائل کے احکام بھی' یہ کتاب حق و باطل میں

فرق بتانے والی ہے اور یہ کوئی ہنسی مذاق (لغو و بے حقیقت) کی بات نہیں ہے۔ جو جابرو مغرور اپنے تکبر سے اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے پارہ پارہ (ذلیل و خوار) کردے گا اور جو اس سے ہٹ کر کہیں اور رشد و ہدایت چاہے گا اللہ تعالیٰ اسے صحیح راستہ سے ہٹا دے گا۔ وہ بھٹکتا ہی پھرے گا۔ یہ کتاب اللہ کی مضبوط رسی ہے، حکمت بھرا اور دانش مندانہ ذکر ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ اہلِ ہوس اور اہلِ باطل اس میں کوئی تبدیلی و تحریف و ملاوٹ نہیں کر سکتے اور نہ ہی زبانیں اس میں خلط ملط اور غلط آمیزش کر سکتی ہیں۔ علماء اس کے پڑھنے اور سمجھنے سے سیر نہیں ہوں گے اور نہ بکثرت پڑھتے رہنے سے پرانا یعنی بے کیف و بے لذت ہوگا (یعنی جب بھی پڑھا جائے ایک نیا لطف محسوس ہوگا) اور نہ اس کتاب کے معانی و مفاہیم اور تشریح و تفسیر کبھی ختم ہوں گے (یعنی اس میں بے شمار علوم و معارف ہیں) یہی وہ قرآن ہے کہ جب جنوں نے اسے سنا تو وہ بلا توقف یہ کہے بغیر نہ رہ سکے "ہم نے عجیب قرآن سنا جو رشد و ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے۔" یہ وہ قرآن ہے کہ جو اس کے مطابق بات کہے گا وہ سچ ہی کہے گا اور جو اس پر عمل کرے گا اجر و ثواب پائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا عدل ہی کرے گا اور جو اس کتاب کی طرف دعوت دے گا (یعنی ایمان اور عمل کرنے کی) وہ لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا..... یہ حدیث شریف کتاب مشکوٰۃ المصابیح میں صفحہ ۱۸۶ پر ہے، طوالت کے خوف سے عربی عبارت نہیں لکھی گئی صرف اس کا ترجمہ ہی پیش کیا۔

ہجرت مدینہ

گزشتہ اوراق میں ہم آپ کی اس ہجرت کا ذکر کر رہے تھے جو آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف فرمائی۔ اسی درمیان میں آپ کے فضائل و معجزات کا ذکر آ گیا جو ہم نے مختصراً بیان کیے ہیں۔

مدینہ شریف کی طرف ہجرت آپ کے اعلان نبوت کے تیرہویں سال ہوئی مکہ میں آپ نے تیرہ سال تک پر جوش تبلیغ اسلام کی اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے اور

اللہ کو ایک ماننے کی دعوت دی۔ مکہ کی یہ زندگی بڑی سخت اذیت ناک، مخالفتوں اور مظالم سے بھری ہوئی تھی جو لوگ ان تمام سختیوں اور ظلم و تشدد کے باوجود اسلام قبول کرتے رہے اور پھر اسلام کو اپنے سینے سے لگایا، ان کا درجہ نہایت بلند ہے اور وہ سابقین اولین کہلاتے ہیں۔ ہجرت کر کے مدینہ آنے کے بعد حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا کہ اب اسلام تیزی سے پھیلے گا۔ آپ نے مدینہ میں رہنے والے یہودی قبائل سے بقاء باہمی کا معاہدہ کیا جس کی خاص بات یہ تھی کہ اندرونی معاملات میں ہم آزاد ہیں لیکن امن قائم رکھیں گے اور اگر کوئی دشمن باہر سے آکر حملہ کرے گا تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس معاہدے سے اندرونی طور پر تو امن و سکون ہو گیا لیکن مدینہ سے باہر دور دراز علاقوں میں مسلمانوں کی جان و مال محفوظ نہ تھے چاروں چاروں طرف کفار مکہ اور مشرکین عرب نے مسلمانوں کے خلاف آگ لگا رکھی تھی مسلمان نکل کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

آخر کار کفار مکہ، مشرکین عرب اور یہودی تو قبائل نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے کئی جنگیں لڑیں جن میں کفار کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور زبردست شکست ہوئی لیکن مسلمانوں کے لیے تجارتی و دیگر آمدورفت کے راستے اب بھی خطرناک تھے، مسلمان آزادی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں جا سکتے تھے۔ آخر کار صلح حدیبیہ کے معاہدے نے مسلمانوں کے لیے آمدورفت کے راستے کھول دیئے اور ۸ھ میں فتح مکہ ہونے کے بعد اسلام کا مکمل اقتدار حجاز عرب پر ہو گیا۔ دراصل اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تبلیغ بلا خوف و خطر آزادی سے کرنے کے لیے تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو صرف چار سال کا وقت ملا یعنی صلح حدیبیہ ۶ھ سے لے کر ۱۰ھ، وقت وفات مبارک تک اس درمیان جس تیزی سے اسلام پھیلا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ۶ھ میں مسلمانوں کی کل تعداد ہزاروں میں تھی مگر فتح مکہ کے بعد آپ کے ساتھ حجۃ الوداع میں مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یہ بات نہ حیرت انگیز ہے نہ تعجب خیز کہ کفار مکہ نے ابتدا ہی سے اسلام پھیلنے کی سخت ترین مخالفت کی۔ اس وقت ایمان لانا بلاشک و شبہ اپنی جان و مال کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ تیرہ سال تک یہی تشدد اور ظلم و جبر ہوتا رہا۔ حیرت میں ڈالنے والی

بات یہ ہے کہ اس ظلم و تشدد کے باوجود اسلام ترقی کرتا رہا۔ اسلام کو جیسے جیسے اس جبرو ظلم سے سہولت ملتی گئی مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں انتہائی پر خطر حالات میں اور بدترین خوف و ہراس کی حالت میں یہ تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی اور ہجرت مدینہ کے ابتدائی چھ سالوں میں جب ذرا اسلام کو محدود پرامن ماحول ملا تو یہ تعداد بڑھ کر ہزاروں میں ہو گئی اور ۶ھ میں جب صلح حدیبیہ ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی آمدورفت کے لیے پُرامن ماحول مل گیا تو اسلام کی ترقی کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی، یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد تو لوگ خود آ آ کر جوق در جوق اور ہجوم در ہجوم اسلام قبول کرنے لگے۔

یہ تاریخی صداقت اس امر کا مستحکم ثبوت ہے کہ اسلام اپنی خوبیوں سے پھیلا، بزور تلوار نہیں۔ بزور تلوار تو انیس سال تک اسلام کو پھیلنے سے روکا گیا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ آخر وہ اسلام کی کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ جس ملک میں بھی گیا پھیلتا گیا۔ بنگلہ دیش، جاوا، سماترا، ملیشیا، سنگاپور، اور انڈونیشیا کہیں بھی تو اسلام کے لیے جنگ نہیں ہوئی، خود چین جہاں اس وقت ایک کروڑ کے قریب مسلم آبادی ہے وہاں نہ کوئی حملہ ہوا نہ تلوار اٹھی مگر ان تمام ملکوں میں اسلام کو ایسی مقبولیت ہوئی کہ مسلم اکثریت ہو گئی اور یہ اسلامی ممالک کہلانے لگے۔ دراصل اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی تعلیم نہایت سادہ سہل اور نہایت درجہ پُرکشش ہے۔

اسلام نے توحید کو ہر طرح کی آمیزش سے بچایا اور نہایت خالص توحید پاک و صاف اور ہر الجھن سے دور رکھ کر اسے لوگوں کے سامنے رکھا۔ فرائض کی ادائیگی اور محرمات (حرام چیزوں) سے بچنا ضروری قرار دیا۔ دنیاداری کے گھریلو معاملات میں بھی حسن نیت پر ثواب کا مستحق بنایا، اس طرح دنیاوی حقوق اور معاملات کو بھی باعث ثواب اور فرائض کی ادائیگی پر بھی اجر و ثواب کا مستحق گردانا، ان سہولتوں اور سادہ تعلیمات نے اسلام کو ہر ملک میں مقبولیت عطا کی، اس لیے اس کا بہت تیزی سے آگے بڑھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مندرجہ بالا سوال کے جواب میں ایک غیر مسلم فرانسیسی محقق موسیو لیبان کی تحقیق پیش کروں۔ مخالف کی گواہی اگر موافقت میں ہو

جائے تو دعویٰ کے ثبوت میں جان پڑ جاتی ہے۔

موسیو لیبان کہتے ہیں:

"فی الواقع تمام مذاہب عالم میں یہ فخر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے پہلے پہل وحدانیت خالص و محض کی اشاعت دنیا میں کی۔ اس خالص وحدانیت کی وجہ سے اسلام کی ساری سادگی اور ساری شان ہے اور یہی سادگی باعث ہوئی ہے اسلام کی قوت اور اسلام کی مضبوطی کی۔ یہ وحدانیت محض ایسی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کیونکہ اس میں کوئی بھید یا پیچیدگی نہیں ہے اور نہ اس میں ان متضاد چیزوں کے ماننے کی ضرورت ہے جو دوسرے مذاہب میں واقع ہوتی ہیں اور جنہیں عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ ایک خدائے واحد مطلق، معبود تمام بندے اس کی نگاہ میں ہیں، یعنی اس کے نزدیک برابر ہیں۔ بہت تھوڑے سے ارکان دین جن کا بجالانا واجب و ضروری اور ان کو نیک نیت اور سچے دل سے بجالانے کی جزا بہشت ہے اور ان کے نہ بجالانے کی سزا جہنم۔"

موسیو لیبان کہتے ہیں:

"اس سے زیادہ صاف و سادہ اور غیر مبہم کون سا مذہب ہو سکتا ہے۔"

مزید لکھتے ہیں: "اسلام کی وضاحت و اعتقادات اور اس کے ساتھ دوسروں کے مقابل میں نیکی اور انصاف جس کی مہر اس مذہب پر کی گئی، اس کی عالم گیر اشاعت کا بہت بڑا باعث ہوا۔ اسلام کی یہی وہ خاصیت اور امتیاز تھا جس میں ان تمام قوموں کو جو مصریوں کی طرح شہنشاہان قسطنطنیہ کے وقت سے عیسائی چلی آرہی تھی، دعوت نبوی ہونے کے ساتھ ہی مسلمان ہو جانے پر آمادہ کر دیا، حالانکہ ایسی کوئی مثال کسی قوم مسلم کی خواہ وہ فاتح ہو یا مفتوح، موجود نہیں ہے جس نے کبھی دین عیسوی قبول کیا ہو۔"

(تمدن عرب از موسیو لیبان، ترجمہ ڈاکٹر سید علی صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۱)

یہی وہ سادہ سہل تعلیم تھی جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی سننے والوں کے ذہن و دماغ میں بغیر کسی دشواری کے سمجھ میں آگئی اور اسے لوگوں نے قبول کر لیا۔ صاحب مشکوۃ شریف نے اپنی کتاب مشکوۃ شریف میں کتاب الایمان عنوان کے ماتحت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک بار ایک

اعرابی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے کہ اس پر عمل کر کے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔" آپ نے فرمایا: "(۱) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ (۲) نماز پنجگانہ فرض پابندی سے ادا کرو۔ (۳) زکوۃ فرض (سال بہ سال) ادا کرو۔ (۴) رمضان شریف کے روزے (سال میں ماہ رمضان میں) ادا کرو۔" یہ سن کر اس اعرابی نے کہا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں آپ کے بیان کردہ عمل میں نہ کمی کروں گا نہ زیادتی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آپ نے فرمایا: اگر کسی کو اس بات سے مسرت حاصل ہو کہ وہ کسی جنتی کو دیکھے تو اس سوال کرنے والے کو دیکھے۔ اس طرح کی حدیث صاحب مشکوۃ نے حضرت طلحہ بن عبداللہ سے بھی اسی کتاب الایمان میں بیان کی ہے۔ دونوں حدیثیں بخاری و مسلم کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں اور حضرت عمر کی روایت کردہ حدیث جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بہ شکل بشری حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان اور اسلام کی تشریح جاننی چاہی تھی جس میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اسلام و ایمان کو نہایت آسان، سادہ اور عام فہم انداز میں بیان فرمایا:

الدین یسر۔ دین نہایت سہل ہے۔

کی بہترین تفصیل ہے۔ جس کو ہر ذہن آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ اسی لیے اسلام ہر ملک میں مقبول ہوا اور تیزی کے ساتھ بڑھا جس کی کوئی مثال دیگر مذاہب میں نہیں ملتی۔ اگر ہم اسلام کی تمام تعلیمات کو نہایت مختصر انداز میں بیان کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نام ہے فرائض پر عمل کرنے اور محرمات سے بچنے کا۔ یعنی ایمان لانے کے بعد اسلام کے فرائض کو پابندی سے ادا کرے اور اسلام میں تمام حرام چیزوں سے سختی سے بچتا رہے۔ اس سے زیادہ سہل اور آسان دین اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے تمام دنیا کو اسی کی طرف دعوت دی اور آپ کی اتباع اور پیروی میں آپ کے بعد آپ کے نائبین اور خلفاء نے دعوت الی الاسلام کا یہی سہل ترین طریقہ

اختیار فرمایا۔

ہزار مخالفتوں کے باوجود مخالفین بھی اسلام کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کر لینے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی عظمتوں کو مان لینے کے لیے مجبور ہیں اور انہیں بہر حال یہ تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے کہ اسلام ہی تمام مذاہب میں ایک حقیقت شناس اور حق و صداقت کا ایک طاقتور مذہب ہے جو نہ کبھی مغلوب ہوا اور نہ کبھی مغلوب ہو گا۔ اور اس کا اپنا ایک خاص تمدن اور معاشرہ ہے جس نے پہلے بھی دنیا کو متاثر کیا ہے اور آئندہ بھی وہ تمام اقوام کو متاثر کرتا رہے گا۔ یہ ایک طاقتور اور مضبوط و مستحکم تمدن اور معاشرہ ہے۔ جو مخالفوں کی ہزار کوششوں کے باوجود نہ فنا ہو سکا نہ فنا ہو گا جبکہ اقوامِ عالم کے تمام مذاہب کا تمدن اور معاشرہ اپنا وجود کھو چکا ہے۔ برطانیہ ہو، فرانس ہو، یورپ ہو، روس ہو یا امریکہ اور جاپان وغیرہ، سو سال قبل جو ان کا معاشرہ تھا وہ اب کہیں نظر نہیں آتا حتیٰ کہ ان کے مذہب کے طور و طریقے بھی زمانہ کی دستبرد کا مقابلہ نہ کر سکے لیکن اسلام کے اصول، اسلام کی قدریں، اسلامی معاشرہ آج بھی اپنی اصل شکل و صورت میں موجود ہے جو اب سے ہزار سال پہلے تھا اور جب تک اسلام باقی ہے، یہ بھی باقی رہے گا۔

ظہورِ اسلام کے بعد عرب کے علوم

اسلام نے علم کو کیا درجہ دیا ہے' اس حقیقت تک اگر پہنچنا ہے تو قرآن پاک کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جگہ جگہ آپ کو اس مقدس کتاب میں ایسی آیتیں ملیں گی جن میں علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ علماء کے درجات و مراتب کیا ہیں۔ اس بچی آسمانی کتاب میں آپ بکثرت اس مضمون کی آیات پڑھیں گے جن میں جہالت کو ام المعائب (بُرائیوں کی جڑ) قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں تو ایسے مضامین سے بھری پڑی ہیں جن سے عالم کی فضیلت غیر عالم پر واضح ہوتی ہے۔ آپ نے وہ ہر ممکن طریقہ اختیار فرمایا جو انسانی دماغ کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کر سکتا ہے یہاں تک کہ ایک عالم کی فضیلت تمام دیگر انسانوں پر مسلم ہو گئی۔ فی الواقع اگر کچھ بھی غور کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ علم ایک ایسی روشنی ہے جو انسان کو بدترین تاریکیوں سے نکال کر ایک روشن و مستقیم راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔ چونکہ معرفت الٰہی' اقرار وحدانیت' یقینِ آخرت' نبوت و رسالت پر ایمان ان جملہ امور کی بنیاد ہی علم پر ہے' اس لیے اسلام میں علم کی مذہبی حیثیت مسلم ہو گئی اور اسے صحیح و حقیقی زندگی کا اہم ترین لازمہ اور جزو قرار دے دیا گیا۔ اگرچہ اسلام نے جس علم کو واجب و ضروری قرار دیا ہے وہ صرف علم دین ہے تاہم وہ دیگر علوم کی تحصیل پر نہ کوئی پابندی لگاتا ہے نہ کوئی اعتراض کرتا ہے' بشرطیکہ ان کی بنیاد یا ان کے نتائج مذہب

کی صداقتوں سے متصادم نہ ہوتے ہوں اور جن کا حاصل خدا سے بغاوت اور نفرت، معاشرت کی تباہی و ہلاکت خیزی نہ ہو جیسے علم کہانت، علم سحر اور علم الاصنام وغیرہ کہ یہ اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت درجہ انسانیت سوز اور دامن شرافت پر بدنما داغ ہیں اور ان کی وجہ سے ایک ایسی توہم پرستی و احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جو انسان کی سچی و بلند زندگی کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ بہرحال اسلام نے ہر ممکن طریقہ سے علم حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہے جس کی نظیر دیگر ملل و ادیان میں نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس دیگر مذاہب میں سے بعض نے تو اپنی بنیادی تعلیمات ہی میں یہ واضح کر دیا کہ اس کی تعلیمات کو صرف ایک مخصوص طبقہ ہی حاصل کر سکتا ہے۔ گویا وہی تمام علوم کا اجارہ دار ہے جیسے ہندوستان کا برہمنی مذہب ہے جس نے اپنی تمامتر ذمہ داری صرف برہمن طبقہ کے سپرد کر دی ہے اور اپنے پیروکاروں میں سے ایک طبقہ کو اپنی کتابیں چھونے تک کی اجازت نہیں دی اور بعض مذاہب نے اپنی تعلیمات کو بنیادی اعتبار سے تو عام رکھا کہ جو چاہے حاصل کرے لیکن عملی طور پر ان مذاہب کے علماء نے اس کی تعلیم کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور دوسرے لوگوں کے لیے صرف اپنی اطاعت و فرمانبرداری لازم و ضروری قرار دی اور اس طرح انہوں نے صرف اپنی مذہبی اجارہ داری قائم کر لی، جیسا کہ یہودی اور عیسائی عالموں نے کیا۔ یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے علم کے دروازے ہر فرد انسانی کے لیے کھول دیئے اور جہالت کو انسانیت کا دشمن قرار دیا۔ اسلامی تعلیمات میں جاہل کو مردہ لاش قرار دیا گیا ہے لیکن جملہ علوم میں اولین درجہ اسلام نے جس علم کو دیا ہے وہ علم دین ہے کیونکہ یہی وہ چیز تھی جس نے ان امیوں کو پستی سے نکال کر ترقی کی آخری منازل تک پہنچا دیا تھا اور اسی تعلیم نے ان کی حیثیت کو اتنا بلند و برتر بنا دیا تھا کہ دیگر اقوام و ممالک پورے احترام کے ساتھ ان کا نام سن کر سر جھکا دیتے تھے۔ جس چیز نے ان کے نفوس میں اس درجہ شرافت و پاکیزگی پیدا کی اور ان کی وحشت و بربریت زائل کر کے انسانیت کے بلند و بالا مقام پر پہنچایا وہ صرف یہی مذہبی علم تھا، اس لیے قدرتی طور پر ان کے لیے اس کا حاصل کرنا اور اسے محفوظ رکھنا بھی ضروری تھا اور اس لیے بھی کہ اسلام دنیا کا آخری اور مکمل ترین مذہب

ہے جس کے بعد دنیا کو کسی اور مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ فی الحقیقت اگر اس امر پر غور کیا جائے تو ہمیں اس دعوے میں سچائی کی پوری پوری جھلک دکھائی دیتی ہے کیونکہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور اس کی تعلیم ہر زمانہ اور ہر قرن کے لیے نہایت مناسب اور اصلاحی ہے، اس لیے بھی مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی اشاعت، آنے والی نسلوں میں کریں اور دور دراز ملکوں میں اسلام قبول کرنے والوں کے لیے اس تعلیم کو محفوظ کریں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو یاد کر لیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے بیان کی ہوئی احادیث کو بھی پوری پوری احتیاط اور صحت کے ساتھ حفظ کر لیتے تھے۔

شیوع اسلام کے بعد اہل اسلام نے جن علوم کو مدون کیا یا ترقی دی، وہ متعدد قسم کے ہیں:

(۱) وہ علوم جو قرآن مقدس سے تعلق رکھتے ہیں جیسے حدیث، تفسیر، فقہ، لغت، تاریخ امم ماضیہ اور قرأت و تجوید وغیرہ۔

(۲) دوسرے وہ علوم جو عربوں کی مایہ ناز زبان عربی سے تعلق رکھتے ہیں جیسے شعر و خطابت وغیرہ۔

(۳) اور تیسرے وہ علوم جو دوسری اقوام و زبان سے عربی میں ترجمہ کرائے گئے مثلاً طب، ہندسہ، فلسفہ، منطق، ہیاۃ، طبیعیات وغیرہ۔ آخر الذکر علوم، علوم دخیلہ کہلاتے ہیں۔ اگر ان تمام علوم کی تفصیل بیان کی جائے تو صدہا دفتر درکار ہیں لیکن مختصراً ضرور ہم ان کا بیان کریں گے۔

یہ ایک تحقیق شدہ حقیقت ہے کہ اہلِ اسلام نے جن علوم کو بھی حاصل کیا یا ترقی دی یا ایجاد کیا ان سب کا مرکز قرآن پاک ہے جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ انہوں نے سب سے اوّل علوم مذہبیہ کو ترتیب دیا، قرآن پاک کو جب لکھنے کی ضرورت درپیش ہوئی تو انہوں نے عربی رسم الخط کی اصلاح کی۔ اس رسم الخط کے حرکات و سکنات و نقاط کی طرف توجہ دی اور آلات کتابت کو ترقی دی۔ قرآن پاک کی جامعیت، وسعت اور ہمہ گیری، فصاحت و بلاغت اور شیریں بیانی سے اہلِ عرب اس درجہ متاثر تھے کہ انہیں

اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت ہی باقی نہ رہی، لیکن اسلام جب سے عرب کی بیرونی دنیا میں پھیلنا شروع ہوا تو غیر عربوں کو قرآن فہمی میں دشواری پیش آئی۔ اس دشواری نے انہیں علم لغت کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے علم لغت کی تدوین و ترتیب میں حصہ لیا، ان میں غیر عربوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

چونکہ قرآن پاک قریش کی زبان میں نازل ہوا اس لیے انہوں نے ان کے اشعار و امثال کی تحقیق شروع کی اور اس سلسلہ میں انہوں نے شعراء کے حالات، ان کی کیفیات شاعری اور ان کے آداب و انساب بھی معلوم کیے۔ لطافت کلام، محاسن شعر و ادب اور حقائق لفظ و معانی پر سیر حاصل مباحث کیے اور اسی کا نام علم ادب ہو گیا۔

قرآن پاک اگرچہ اہل عرب کی مادری زبان میں نازل ہوا تاہم بعض بعض مقامات اس میں ایسے بھی ہیں جن کو سمجھنے میں خود عربوں کو دشواری پیش آتی تھی کیونکہ بے مثل آسمانی کتاب صرف ایک ادبی چیز ہی نہیں بلکہ اس میں انسانی زندگی کو راہ مستقیم پر لانے اور اس میں اصلاح و تزکیہ کے لیے ہر قسم کی چیز بیان کی گئی ہے۔ جس میں توحید الٰہی سے لے کر تاریخی حقائق، امثال امم، نبوت، رسالت، مواعظ حسنہ، اخلاق فاضلہ اور انسانی معاشرت و نظام حکومت وغیرہ سے متعلق جملہ امور بیان کیے گئے ہیں، اس لیے خود عربوں کو بھی ان امور کے سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مشکلات کا سامنا ضرور کرنا پڑتا تھا اور ایسے مقامات کو سمجھنے کے لیے وہ احادیث نبوی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پھر کچھ امور ایسے بھی تھے جن کو قرآن کریم میں اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے اور ان کی تفاصیل صرف احادیث نبوی ہی سے حاصل ہو سکتی تھیں اس لیے احادیث کی طرف ان کی احتیاج ناگزیر تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر ان کو جمع احادیث اور ان کی روایت بالتسلسل کا شوق پیدا ہوا۔

پھر جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے کہ انہوں نے احادیث کی حفاظت اور ان کو اغلاط و من گھڑت احادیث کے اختلاط سے بچانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان سے خود احادیث رسول اللہ ﷺ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گئیں۔ ان احادیث کے ذریعہ سے انہیں آیتوں کا شان نزول، مشترک المعنی الفاظ کی مراد کا تعین، بعض

مخصوص لغات کے معنی و تشریح، اجمال و واقعات کی تفصیل، احکام کی تشریح اور فہم معانی میں بڑی مدد ملی جو آئندہ ترقی کر کے ''علم تفسیر قرآن'' کی صورت میں مدون ہو کر سامنے آیا۔

فتوحات اسلامی کی ترقی اور حکومت اسلامی کی وسعت نے مسلمانوں کے لیے نئے نئے حالات پیدا کر دیئے۔ انہوں نے ممالک فتح کیے، وہاں انہیں نئی نئی ضرورتوں سے دوچار ہونا پڑا اور ان ضرورتوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ان مسائل کا حل ایسے واقعات سے تلاش کریں جو ان سے ملتی جلتی شکل میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو دورانِ غزوات میں پیش آئے، اس لیے انہوں نے فتوح و مغازی کے حالات ترتیب دیئے۔

اسی طرح ان کی مختلف ضرورتیں اور پیش آمدہ نئے نئے حالات انہیں تاریخ، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، طبقات فقہاء، طبقات محدثین، علم کلام، علم لغت، نحو و صرف اور معانی و بیان کی تدوین و ترتیب کے لیے مجبور کرتے رہے اور ان میں انہوں نے اس درجہ تحقیق و تدقیق اور انہماک و دلچسپی سے کام کیا کہ یہ سب مستقلاً جُدا جُدا علم ہو گئے۔ یہی تمام علوم، علومِ اسلامیہ کہلاتے ہیں۔

ان تمام امور پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے جن علوم کو بھی ترقی دی، ان سب کا مرکز قرآن پاک ہے اور یہ تمام علوم معانی قرآن پاک ہی کو سمجھنے کے لیے ترتیب دیئے گئے۔ یہ وہ علوم ہیں جن کی نظیر دیگر ملل و ادیان میں معدوم ہے۔ دیگر اقوام کے مذہبی علوم نہ اتنے وسیع تھے اور نہ اتنے کثیر، خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اپنے مذاہب سے اس درجہ شغف اور دلچسپی نہ تھی یا یہ کہ ان مذاہب میں ایسی جامعیت و ہمہ گیری نہ تھی اور نہ ہے جو اسلام کے اندر پائی جاتی ہے کیونکہ یہی مذہب دنیا کا آخری و قیامت تک باقی رہنے والا مذہب ہے جو تمام ادیان کا ناسخ ہے۔ اب دنیا کو نہ کسی نئے نبی کی ضرورت ہے، نہ مذہب کی۔

عربوں نے نہ صرف یہ کہ فقط اپنے مذہبی علوم کو ترقی دی بلکہ ان کے ہاتھ جو علم بھی آ گیا اس میں انہوں نے بیش بہا اضافے کیے اور یہ چیز عربوں کے لیے اور بھی زیادہ فضیلت اور ان کے دماغی تفوق و برتری کا باعث بن جاتی ہے کہ باوجود اس امر کے کہ وہ

ایک وسیع حکومت کے انتظام و انصرام میں مشغول تھے انہوں نے قوانین و شرائع مملکت قرآن پاک سے مستنبط کیے۔ دوسری طرف علوم مذہبی کی تحقیق کی اور تیسری جانب انہوں نے علوم عقلیہ و دخیلہ کو بھی بامِ عروج پر پہنچایا۔ علوم و مملکت مذہب و حکومت کی یہ جامعیت بجز اہلِ عرب کے ان سے قبل اور ان کے بعد بھی کسی اور قوم کو نصیب نہ ہو سکی۔ اہلِ یونان فلسفہ و طب کے موجد کہلاتے ہیں مگر وہ حکومت سے محروم رہے۔ ان میں حکومت کرنے کی اہلیت ہی نہ تھی۔ اہلِ روما نے یونانیوں سے فلسفہ اور دیگر علوم حاصل کیے لیکن وہ امور مملکت میں غیر معمولی انہماک کی وجہ سے اس میں کوئی معتدبہ اضافہ نہ کر سکے، البتہ انہوں نے قوانین حکومت بہترین وضع کیے اور ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد قائم کی جو یونانیوں کو نصیب نہ تھی۔

ایک عیسائی مورخ کے یہ الفاظ صداقت سے کس درجہ لبریز ہیں کہ "گویا اہلِ روما فتح و سلطنت کے لیے بنائے گئے تھے اور اہلِ یونان تصور اور خیال کے لیے۔"

عصر حاضر میں بھی ممالک مغربی نے علوم سائنس میں بیش از بیش ترقیاں کی ہیں اور قوانین حکومت میں جدید اضافے کیے ہیں مگر یہ اقوام مذہب سے اسی درجہ بے تعلق بھی ہو گئی ہیں۔ مذہب میں نہ کوئی تحقیق ہوئی اور نہ اسے درخور اعتنا سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی ہمت و نگاہ صرف امور دنیا تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، لیکن عربوں میں یہ تمام باتیں جمع تھیں کیونکہ انہوں نے اعلیٰ درجہ کا نظام حکومت قائم کیا اور وسیع ترین سلطنت قائم کی۔ یونانیوں سے جس قدر علوم انہوں نے اخذ کیے انہیں اپنی صداقت، فہم و ذکاوت طبع سے منازل ترقی پر پہنچایا۔ دیگر اقوام و ممالک مثلاً ہندی، فارسی اور کلدانیوں سے بھی علوم نقل کیے اور انہیں اقصائے عالم میں پھیلا دیا۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود خود ہی بہت سے علوم ایجاد کیے جن کی ایک طویل فہرست ہے اور جو اسلامی علوم کہلاتے ہیں۔ علم فصاحت و بلاغت انہیں کی لطافت طبع اور جودت دماغ کا حصہ ہے۔
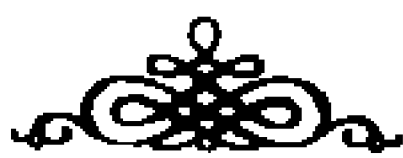
تدوینِ علوم

قرآن کی کتابت

اہلِ عرب امی تھے، وہ نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ ان کے پاس جو بھی علوم تھے وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آتے تھے۔ چونکہ فطرتاً عرب کا حافظہ قوی تھا، اس لیے ابتداء اسلام میں بھی انہیں لکھنے کی چنداں ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنتے تھے اسے زبانی یاد کر لیتے تھے۔ قرآن پاک جو کہ رفتہ رفتہ نازل ہو رہا تھا اس کی جو بھی آیت نازل ہوتی اسے بہت سے صحابہ حفظ کر لیتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لکھنے کی نسبت حفظ کر لینے میں قرآن شریف و حدیث پاک کی زیادہ بہتر حفاظت ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے لکھنا سیکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ اگرچہ اس وقت عربوں میں کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے اور خود مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسے اشخاص کا تھا جن کو فنِ تحریر سے واقفیت حاصل تھی لیکن ان کا یہ علم صرف سفارت کے کام آتا تھا۔ مذہب کے لیے انہوں نے اس کو استعمال نہ کیا تھا لیکن جب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جنگِ یمامہ کے موقع پر حفاظ قرآن کی ایک بہت بڑی تعداد شہید ہو گئی تو آپ کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں حفاظ کی شہادت کی وجہ سے قرآن پاک ضائع نہ ہو جائے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

رائے سے قرآن پاک کو لکھا گیا۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو اسلام میں لکھی گئی لیکن اس وقت تک فنِ تحریر مکمل نہ تھا۔ قرآن خط کوفی میں لکھا گیا تھا لیکن نہ اس میں نقطے تھے نہ حرکات۔ (جرجی زیدان)

کیونکہ یہ خط نبطی اور سریانی رسم الخط سے اخذ کیا گیا تھا اور یہ دونوں رسم الخط نقاط و حرکات سے خالی تھے۔ نصف صدی تک قرآن پاک بلانقطہ و بلاحرکت پڑھا جاتا رہا لیکن اس میں بے شمار غلطیوں کا احتمال تھا۔ اہلِ عرب باوجود زبان دانی اس میں دشواریاں بھی محسوس کرتے تھے، اس لیے ابوالاسود موجد علم نحو متوفی ۶۹ھ نے اس رسم الخط میں حرکات و نقاط ایجاد کیے، لیکن یہ نقاط خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج بن یوسف کی فرمائش سے نصر بن عاصم کاتب نے قرآن پاک میں لگائے۔

(تاریخ تمدن اسلامی، ابن خلکان، جلد ۲)

ابتداء اسلام میں لکھنے کے لیے کوئی خاص چیز نہ تھی۔ بنی امیہ کے آخری دور تک لوگ عموماً چمڑے اور ہرن وغیرہ کی کھال پر لکھا کرتے تھے۔ عبداللہ السفاح خلیفہ عباسی کے وزیر خالد بن برمک نے ان چمڑے، پٹھوں اور لفافوں کو کتاب کی شکل میں کر دیا۔ اس کے بعد ہارون الرشید کے وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی نے کاغذ رائج کر دیا لیکن بعض لوگ اس وقت بھی کاغذ کی نسبت کپڑے پر لکھنا زیادہ بہتر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ فارابی کی جس قدر کتابیں دستیاب ہوئی ہیں وہ سب کپڑوں پر لکھی ہوئی تھیں جن کو رقاع کہتے تھے۔ (ابن خلکان صفحہ ۷۵ جلد ۲) بہر حال سب سے پہلے عربوں نے جو چیز لکھی وہ قرآن پاک ہے لیکن اس سے ان کی کسی قسم کی ذہانت کا پتا نہیں چل سکتا کیونکہ قرآن پاک ان کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ تو وحی الٰہی ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی، عربوں نے تو صرف اس کو لکھ لیا۔

ابتداء اسلام میں حدیث، تفسیر اور فقہ جُداگانہ علوم نہ تھے۔ عرب صرف دو ہی چیزوں کو جانتے تھے: قرآن پاک اور حدیث شریف۔ وہ کسی مسئلہ میں سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے اور جب ان کی عقل قرآن سے وہ مسئلہ حل کرنے میں قاصر رہتی تو وہ احادیث میں اس کا حل تلاش کرتے تھے اور اس کی مدد سے مشکلات

حل کر لیتے تھے۔ اسی طرح قرآن پاک کے وہ مشکل مقامات جن کو سمجھنے میں نہ عقل معاون ہو سکتی ہے نہ تاریخ (مثلاً ناسخ و منسوخ یا الفاظ متشابہات وغیرہ) ان کو سمجھنے کے لیے بھی احادیث کی طرف احتیاج تھی لیکن اہلِ عرب کی اس قسم کی مشکلات باآسانی حل ہو جاتی تھیں کیونکہ اس وقت تک صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد بکثرت احادیث یاد رکھتی تھی۔ خاص طور سے مدینہ تو ایسے صحابہ کا مرکز تھا جس میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ، خلفاء اربعہ اور دیگر صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین موجود تھے۔ جب کسی مسئلہ میں کوئی اشکال در پیش ہوتا تو ان بزرگوں سے حل ہو جاتا تھا۔

تدوینِ حدیث

جب فتوحاتِ اسلامی کو ترقی ہوئی اور صحابہ کرام منتشر ہوئے تو جس شخص کو جتنی حدیثیں یاد ہوتی تھیں وہ ان کی پوری پوری تبلیغ کر دیتا تھا، لیکن اگر کوئی شخص جملہ احادیث یا اکثر احادیث کا علم حاصل کرنا چاہتا تو اسے ان تمام مقامات کا سفر کرنا پڑتا جہاں ایک حدیث کا بھی یاد رکھنے والا موجود ہوتا۔ اور یہ ایک بہت بڑی دشواری تھی جس پر قابو پانا ہر شخص کے بس کا کام نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عثمان غنی خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اندر ہی اندر بعض ایسے فتنہ پرور پیدا ہو گئے تھے جو احادیث وضع کرنے لگے (یعنی اپنے دماغ سے گھڑ لیتے) ایسے لوگ اسلام کے لیے بہت خطرناک تھے۔ ان کی وجہ سے اسلام زبردست خطرہ میں گھر گیا تھا کیونکہ اہلِ اسلام کے دین و دنیا کا مدار اسی پر تھا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ہر قول و فعل صداقت کے ساتھ بیان کیا جائے اور اسے ہر ممکن کذب بیانی و دروغ گوئی سے محفوظ رکھا جائے، اس لیے انہوں نے ہر ممکن جدوجہد اس امر میں کی کہ اسلام اس فتنہ وضع احادیث سے محفوظ رہے مگر اس امر کا دریافت کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا، اس لیے صورت یہ اختیار کی گئی کہ ہر وہ شخص جو حدیث کی روایت کر رہا ہے وہ از اوّل تا آخر نام بنام سب راویوں کو بیان کرے کہ "میں نے فلاں اور فلاں نے فلاں سے اور فلاں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ایسا سنا" تاکہ یہ

معلوم ہو سکے کہ اس حدیث کے بیان کرنے والے قابلِ اعتبار و لائقِ اعتماد حضرات ہیں یا نہیں۔ اس طریقہ کا نام سند رکھا گیا۔ (اسی سلسلہ میں بعد کو اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ محدثین کے طبقات مقرر کیے جائیں چنانچہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین وغیرہ طبقات بنائے گئے) لیکن ابھی تک یہ سب کام زبانی ہی تھے۔ حدیث ضبط تحریر میں نہ آئی تھی۔ سب سے پہلے حضرت امام مالک[1] علیہ الرحمہ نے ہارون الرشید خلیفہ عباسی کے زمانہ حکومت میں احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام موطا امام مالک ہے، لیکن بعض کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ابن جریج نے اس فن میں کتاب مدون کی۔ پھر محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمہ نے انھیں کی ترتیب پر صحیح بخاری شریف کو ترتیب دیا۔ یہ اپنے زمانہ کے امام المحدثین تھے۔ ان کے بعد پھر برابر احادیث کی تدوین و ترتیب کا کام کیا جاتا رہا جن میں سے یہ چھ مجموعے زیادہ قابل اعتماد قرار دیئے گئے:

(۱) بخاری شریف مرتبہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۲۵۶ھ۔

(۲) مسلم شریف مرتبہ امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۲۶۱ھ۔

(۳) ابوداؤد شریف مرتبہ امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ۔

(۴) ترمذی شریف مرتبہ امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۲۷۹ھ۔

(۵) نسائی شریف مرتبہ امام عبدالرحمٰن نسائی متوفی ۳۰۳ھ۔

(۶) ابن ماجہ شریف مرتبہ ابوعبداللہ محمد بن یزید الربعی متوفی ۲۷۳ھ۔

ان کے علاوہ احادیث کے اور بھی قابل اعتبار و استناد مجموعے مرتب ہوئے لیکن جو مرتبہ مذکورہ بالا چھ مجموعوں کو حاصل ہے، وہ اوروں کو نہیں۔

جب علم حدیث کی تدوین و ترتیب سے فراغت ہوئی تو انھوں نے اس کی اسناد مسلسل کی طرف توجہ کی۔ جب کوئی شخص حدیث بیان کرتا تو اس کے ساتھ ہی ان

[1] بعض محققین کی تحقیق یہ ہے کہ حدیث کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا، بلکہ یہ سلسلہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ حیات مبارکہ سے شروع ہو گیا تھا۔ خود آپ نے یمن کے ایک شخص ابوشاہ کے لیے اپنا فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا خطبہ لکھ کرا دینے کو فرمایا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲ مصنف)

لوگوں کے نام بھی بیان کرتا جن کے ذریعہ یہ حدیث اس کو ملی یہاں تک کہ یہ سلسلہ صاحبِ حدیث حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ تک پہنچا دیتا۔ رسول اللہ ﷺ اور راوی حدیث کے درمیانی واسطوں کے نام و حالات معلوم ہو جانے کی وجہ سے اس امر کی تحقیق میں آسانی ہوگئی کہ کونسی حدیث صحیح ہے اور کونسی ضعیف یا موضوع (یعنی من گھڑت) اسناد کا یہ سلسلہ مسلمانوں نے صرف حدیث ہی کے لیے مخصوص نہ رکھا' بلکہ دیگر علوم مثلاً فقہ و اصول فقہ اور تاریخ میں بھی وہ اس کی پابندی کرتے تھے یہاں تک کہ جب کوئی شخص کسی تاریخی واقعہ کو بیان کرتا تو وہ اس کا سلسلہ اس شخص تک پہنچا دیتا جس نے وہ واقعہ بچشم خود دیکھا ہو یا وہ اس ہنگامہ میں موجود رہا ہو' جیسا کہ واقدی وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں اسی اصول کا خیال رکھا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی مثال دنیا کی دیگر اقوام و ملل میں نہیں ملتی لیکن جب اس احتیاط کے باوجود بھی احادیث صحیحہ مکمل طور پر احادیث موضوعہ سے ممتاز نہ ہوئیں تو راویوں کے لیے کچھ شرائط ضروری قرار دے دی گئیں جیسے ضبط' عدل' حفظ اور اسناد کے راویوں کی باہم ملاقات وغیرہ اسی اعتبار سے احادیث کے بھی درجات حسن' صحیح' ضعیف' قوی' متصل' منقطع' شاذ و غریب اور مرسل وغیرہ مقرر کیے گئے۔

راویوں کے لیے جو شرائط لازمی قرار دی گئی تھیں ان کی تحقیق کے لیے ان کے حالات زندگی کا جاننا ضروری ہوا' اس لیے سب سے پہلے ان کے طبقات مقرر کیے گئے۔ سب سے پہلا درجہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا' پھر تابعین کا' اس کے بعد تبع تابعین' مجتہدین' مرتبین و شارحین تھے رضی اللہ عنہم اجمعین۔ جن کتابوں میں ان کے حالات زندگی سے بحث کی گئی ہے' وہ کتب اسماء الرجال کے نام سے مشہور و موسوم ہیں۔ اسناد کے اقسام' روایت کی شرطیں اور حدیث کے درجات کا بیان اصول حدیث کہلاتا ہے اور اس فن کی سب سے زیادہ مستند و معتبر کتاب نخبۃ الفکر ہے۔

غرض! اہلِ اسلام نے احادیث پاک کو غلط اور من گھڑت چیزوں سے بچانے کے لیے جو کوششیں کیں اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث شریف ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گئی اور اس کا سب سے وسیع و عظیم

حصہ علم اسماء الرجال ہے، جس میں تمام رواۃ حدیث کے حالات زندگی بالتفصیل درج ہیں اور یہ علم صرف مسلمانوں کے مذہب ہی کے ساتھ مخصوص ہے جس کی مثال دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ اس لیے بجا طور پر پورے فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی اب تک نہایت محفوظ حالت میں چلی آتی ہیں جس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

علم فقہ

اہلِ اسلام کا یہ وہ مایہ ناز اور عدیم المثال علم ہے کہ وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے۔ یہ علم بھی علوم اسلامیہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ممتاز شان و خصوصیت کا مالک ہے۔ اس علم میں انسان کی پیدائش سے لے کر عبادت، معاشرت، معاملت، صنعت و حرفت، تجارت، شراکت و ملکیت، داخلی و خارجی سیاست، قوانین ملکی اور جملہ امور مذہبی کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

ابتداء فقہ اسلامی (Mohammadan Law) کی یہ صورت نہ تھی کیونکہ صاحب شریعت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنفس نفیس اس عالم میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تھا تو آپ بذریعہ وحی یا الہام اس کا حکم بیان فرما دیتے تھے۔ آپ کے اس دنیا سے پردہ فرما لینے کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جدید مسائل و پیش آمدہ ضرورتوں کا حل قرآن و حدیث سے استخراج فرما لیتے تھے۔ جن حضرات کو استخراج مسائل میں عبور و مہارت حاصل تھی ان میں پہلا درجہ خلفاء اربعہ کا ہے، پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عمار بن یاسر، حضرت حذیفہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت سلمان فارسی، حضرت ابودرداء اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مشہور تر ہیں۔ ان حضرات کو قراء کا لقب دیا گیا لیکن بعد میں ایسے حضرات کو فقہاء کے لقب سے یاد کیا جانے لگا چنانچہ طبقہ تابعین میں سات فقیہ مشہور ہوئے: حضرت سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، قاسم، عبداللہ،

عروہ، سلیمان اور خارجہ۔ (ابن خلکان)

اوائل اسلام میں فقہ، حدیث، تفسیر اور قرأۃ ایک علم شمار کیے جاتے تھے، اسی لیے ان علوم کے جاننے والوں کو قاری یا مفسر کا لقب دیا جاتا تھا لیکن بعد میں یہ علوم ترقی کر کے مستقلاً علیحدہ علیحدہ علم بن گئے اور فقہ کے جاننے والے فقیہ کہلانے لگے۔

اصول فقہ

جب سلطنت اسلامی اپنی عظیم ترین فتوحات کی وجہ سے وسیع سے وسیع تر ہوئی تو نئے نئے مسائل اور ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ ان مسائل اور ضرورتوں کو حل کرنے کے لیے علماء اسلام کو احساس ہوا کہ کچھ ایسے اصول و قوانین ہونے چاہئیں جن کے ذریعہ سے باآسانی قرآن و حدیث سے ہر نئی مشکل اور ہر نئے مسئلہ کا استخراج و استنباط صحیح طریقہ سے کیا جا سکے، چنانچہ قرآن کریم کے عمیق ترین مطالعہ اور حدیث شریف میں غور و فکر کے بعد وہ ان احکام کے وجوہ و اسباب معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کی وجہ سے وہ احکام و مسائل قرآن کریم و حدیث شریف میں بیان کیے گئے تھے۔ ان وجوہ و اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے ایسے اصول و قوانین مرتب کیے جن کے ذریعہ سے استخراج و استنباط مسائل میں کافی حد تک سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ انہیں اصول و قوانین کا نام اصولِ فقہ رکھا گیا۔

قرآن و حدیث سے احکام کے جو وجوہ اسباب اخذ کیے گئے، ان میں علماء کے اندر باہم اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض علماء نے ایک حکم کی وجہ قرآن و حدیث کی روشنی میں گہرے مطالعہ کے بعد ایک چیز کو قرار دیا تو دوسرے علماء نے اسباب و قرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسری چیز کو اس کی وجہ قرار دیا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذاہب اربعہ پیدا ہو گئے اور فقہ اسلام چار صورتوں میں ہمارے سامنے آ گیا۔ فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی، فقہ حنفی جن میں سے آخر الذکر سب سے زیادہ مکمل و تحقیقی ہے اور اس کے مقلدین کی تعداد باقی کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ اصول فقہ کے ذریعہ سے جو احکام و مسائل قرآن و حدیث سے استخراج کیے گئے ان کا نام فقہ رکھا گیا۔ رفتہ

رفتہ یہ علم ترقی کرتا رہا اور وسیع تر ہو گیا یہاں تک کہ یہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو گیا خواہ وہ معاملہ انفرادی و شخصی ہو یا اجتماعی و قومی، ملکی و سیاسی ہو یا مذہبی و ملی۔ یہ فقہ چونکہ تمام تر قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور اس کا کوئی مسئلہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے دائرہ سے باہر نہیں، اس لیے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اس کے حاوی ہونے کی وجہ سے قرآن کریم کی جامعیت بوجوہ احسن ثابت ہو جاتی ہے۔

علم فقہ کی یہ ترقیاں بنی عباس کے دور حکومت سے شروع ہو کر برابر نشوونما پاتی رہیں۔ رفتہ رفتہ فقہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن میں مسائل کو قرآن و حدیث سے بوضاحت ثابت کیا جاتا تھا پھر ان کی شروح لکھی گئیں اور اس کے بعد فتاویٰ مرتب کرنے کا رواج قائم ہوا جن میں بڑے بڑے ماہر و کامل فقہاء ان سوالات کو مع جوابات کے درج کر دیتے تھے جو عامتہ الناس وقتاً فوقتاً اپنی ضرورتوں کے مطابق ان سے دریافت کرتے تھے۔ ابتداء میں ان فتاویٰ میں مسائل کا سوال درج نہ ہوتا تھا صرف جوابات درج ہوتے تھے، بعد میں جواب کے ساتھ سوال بھی درج کیا جانے لگا۔ فقہ کی یہ کتابیں عربی سے ہر زبان میں ترجمہ کر لی گئیں۔ اردو زبان میں بھی بڑی بڑی فقہ کی کتابوں کا ترجمہ کر لیا گیا ہے اور یہاں کے علماء نے ان کی ترتیب اپنے اپنے طریقہ پر بھی کی ہے۔

ہندوستان کے اجلہ فقہاء نے اپنے اپنے فتاویٰ اردو زبان میں مرتب فرمائے۔ اردو کے فتاویٰ میں سب سے زیادہ مستند اور اعلیٰ درجہ فتاویٰ رضویہ کو حاصل ہے جو امام الفقہاء حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۱۳۴۰ھ نے مرتب فرمایا ہے۔ فقہ کی دوسری اردو کی کتابوں میں جو درجہ "بہار شریعت" کو حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کو نہیں۔ یہ کتاب حضرت مولانا امجد علی اعظمی صاحب رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۱۳۶۷ھ نے مرتب فرمائی۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ اس میں قرآن کی وہ آیات جو احکام سے متعلق ہیں مع متعلقہ احادیث کے نہایت حسن ترتیب سے بوجوہ احسن جمع کر دی گئی ہیں اور اس کے ساتھ عامتہ الورود مسائل بھی نہایت اچھے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اردو میں فقہ حنفی کے بارے میں اس سے

زیادہ معتبر، مستند اور بہتر کوئی دوسری کتاب اب تک مرتب نہیں ہو سکی۔

علم کلام

اس علم کی بنیاد بھی اسی دور حکومت میں قائم ہوئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہان بنی عباس کو بعض مخصوص وجوہات کی بنا پر فلسفہ و منطق سے کافی شغف تھا اور یہ علم چونکہ زیادہ تر یونانی و لاطینی زبانوں میں تھا، اس لیے اس کے تراجم کرانے کے لیے انہیں زبانوں کے بڑے بڑے علماء و ماہرین ملازم رکھے گئے۔ بنی عباس کے زمانہ میں چونکہ رائے اور خیال کے اظہار کی کافی آزادی حاصل تھی اس لیے ان بیرونی غیر مسلم علماء و ماہرین کو اسلام کی تعلیمات پر اعتراضات کرنے کا پورا پورا موقع تھا۔ یہ لوگ نہایت بے خطر و بیباکانہ اعتراضات کرتے تھے۔ ان کے یہ اعتراضات زیادہ تر فلسفیانہ و منطقیانہ ہوتے تھے، اس لیے ان کا اسی رنگ میں جواب دینے کے لیے علماء اسلام کو بھی فلسفہ و منطق کا علم حاصل کرنا ناگزیر ہوا، نیز مسائل حاضرہ و جدیدہ ضروریات و مقتضیات زمانہ کو بھی پورا کرنے کے لیے فقہ میں بھی قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ دلائل عقلی سے کام لینا ضروری ہو گیا لیکن فقہی مسائل میں عقلی دلائل و قیاس کا استعمال زیادہ تر اہلِ عراق کرتے تھے جن کے پیش رو حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ عقلی دلائل و قیاس قرآن کی روشنی میں ہی تعلیمات اسلام کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

ان کے مقابلہ میں اہلِ مدینہ تھے جو اہلِ حدیث کہلاتے تھے، جن کے سربراہ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ اہلِ عراق اور اہلِ مدینہ کے طریق کار میں یہ اختلاف کیوں تھا، اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ بغداد میں دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اہلِ عراق کو جس ماحول سے واسطہ پڑا تھا، وہ فلسفیانہ و منطقیانہ ماحول تھا۔ ان کے سامنے دنیا کے ہر خطہ کا بڑے سے بڑا عالم معترض بن کر آتا تھا جس کا جواب دینا ان کے لیے اسی نوعیت سے ضروری تھا لیکن اہلِ مدینہ دارالحکومت سے دُور پُرسکون حالت میں تھے، اس لیے انہیں عقلی دلائل کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ

تعالیٰ علیہ کے اصحاب میں قاضی ابو یوسف، محمد بن الحسن شیبانی، زفر بن معذیل اور حسن بن زیاد رحمہم اللہ تعالیٰ مشہور ترین ہیں جنھوں نے علم فقہ کی اعلیٰ درجہ کی خدمات انجام دی ہیں اور جن کی بدولت آج اس علم کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ دنیا کا بہترین، جامع و وسیع تر قانون کہلاتا ہے جس کا کہ وہ مستحق بھی ہے۔

فقہ اسلام پر غیر مسلم مورخین کی رائے

ماہ اگست ۱۹۳۷ء میں "تقابلی قانون کانفرنس" مقام لاہائی میں منعقد ہوئی جس میں بین الاقوامی دنیا کے ماہر قانون دان جمع ہوئے۔ وہاں آزادانہ ہر ملک اور مذہب کے مذہبی قوانین اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر مقالے پڑھے گئے اور کھل کر بحث ہوئی۔ اس بین الاقوامی تقابلی قانون کانفرنس میں غیر مسلم ماہرین نے اسلامی قانون سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا انہیں مجلّہ "الاہرام" اور "ہدیٰ الاسلام" قاہرہ (مصر) نے شائع کیا۔ اس کانفرنس میں مصری علماء قانون اسلام شریک تھے۔ ان بیانات کا خلاصہ مع دیگر ماہرین قانون کی رائے کے محترم حسن احمد الخطیب نے مرتب کیا اور اپنی کتاب "فقہ الاسلام" کے آخر میں شائع کیا۔ مندرجہ ذیل اسی سے ماخوذ ہیں:

(ا) پروفیسر شبرل جو وائنا یونیورسٹی کے قانون کالج کے پرنسپل رہے، ۱۹۳۷ء کی کانفرنس میں کہتے ہیں:

> "عالم انسانیت کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسی شخصیت اس سے منسوب ہے۔ انہوں نے امی ہونے کے باوجود ایسی شریعت تیرہ سو سال پہلے پیش کی کہ اگر ہم اہلِ مغرب دو ہزار سال کے بعد بھی اس کی اونچی چوٹی پر پہنچ جائیں تو ہم اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھیں گے۔"

اسی کانفرنس میں

(۲) پروفیسر ومبری نے ایک ترک ادیب کو مخاطب کر کے کہا:

"تمہاری فقہ اسلامی اس قدر وسیع ہے کہ مجھے تعجب ہوتا ہے جب

میں یہ خیال کرتا ہوں کہ تم نے کیوں اپنے ملک اور زمانے کے موافق احکام اور رفاہی نظام فقہ اسلامی سے اخذ نہیں کیے۔"

(۳) فارس الخوری نے، جو ایک زبردست عیسائی عالم اور لیڈر ہیں، دمشق میں منعقدہ میلاد النبی ﷺ کے مبارک یادگاری جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے جوش کے ساتھ کہا:

"محمد ﷺ دنیا کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔ زمانہ ان کا کوئی ہمسرو نظیر پیدا نہیں کر سکا۔ انہوں نے جو مذہب پیش کیا وہ مذاہب عالم میں سب سے زیادہ مکمل ہے۔ یہ پاکیزہ شریعت چار ہزار سے بہت زیادہ علمی، سماجی اور قانونی مسائل کا مجموعہ ہے، لہٰذا انصاف پسند قانون دانوں کو اس شریعت کے محاسن کا اعتراف کرنا پڑا جس کی بنیاد اللہ کے نام پر رکھی گئی تھی۔ یہ شریعت ترقی یافتہ نظام اور علمی حقائق کے عین مطابق ہے۔"

(۴) لاہائی کانفرنس ماہ اگست ۱۹۳۷ء میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی تھی جس میں اسلامی شریعت کی پائیداری اور اس کے اعلیٰ مقام کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں ساری دنیا کے تمام ماہرین قانون جمع ہوئے تھے۔ اس قرارداد کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اسلامی شریعت ایک زندہ قانونی نظام ہے جو ترقی کرنے اور جدید تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، بلکہ یہ اس قابل ہے کہ اس کی تقلید کی جائے۔"

علمِ ادب ولغت

فہم قرآن اور اس کی عبارات سے معانی و مطالب اخذ کرنے کے لیے اہلِ اسلام کو پوری عربی زبان کا جائزہ لینا پڑا کیونکہ زبان خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک کی کیوں نہ ہو اس کے امثال و محاورات، تراکیب کلام، مواقع استعمال وغیرہ کو فہم معانی اور اداء مفہوم میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ جب تک الفاظ کے افراد و ترکیب، واحد جمع، تذکیرو تانیث، معرفہ و نکرہ، فصیح و غریب، محل استعمال اور خود الفاظ کی ساخت و وضع وغیرہ کا علم نہ ہو

نہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ بر محل۔ اسی طرح ادائے معانی و فہم مطالب کے لیے تشبیہ و استعارات و کنایات وغیرہ کا علم بھی ضروری ہے' اس لیے قرآن کریم، تفسیر اور افہام معانی کے سلسلہ میں اہلِ عرب کے اشعار و ضرب الامثال کی خوب خوب چھان بین کی گئی۔ مسلمان ان امور کی تحقیق میں صحرا بہ صحرا گشت کرتے رہے اور بدوی عربوں کی زبان سے' جو کہ نہایت خالص اور بے میل تھی' تحقیق کرنے کے بعد ایک علم مرتب کیا گیا جس کا نام علمِ ادب رکھا گیا۔ یہ علم کئی شعبوں میں منقسم ہے کیونکہ اس میں بعض امور ایسے ہیں جو الفاظ کی ساخت اور ان کے تغیر و تبدل' واحد و جمع وغیرہ سے متعلق ہیں جس کو علم الصرف یا علم لغت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بعض امور اس میں ایسے ہیں جن کا تعلق الفاظ کی تراکیب' اعراب' تعریف و تنکیر' تذکیر و تانیث وغیرہ سے ہے اور یہ علم النحو کہلاتا ہے۔ اس علم کے موجد ابوالاسود دوائلی ہیں جن کی وفات ۶۹ھ میں ہوئی۔ یہ کبار تابعین میں سے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ رابع کے صحبت یافتہ ہیں۔

تھوڑے سے غور و فکر سے بھی اگر کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت کسی زبان کے قواعد و ضوابط اس زبان کے بولنے والوں کے لیے فطری ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا زبان کو استعمال کرنا اور اس کی نحو و صرف وغیرہ قواعد جاننا دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ انہیں نہ صرف پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ نحو' ہاں دیگر افراد کے لیے جو اس زبان کو حاصل کرنا چاہتے ہیں صرف و نحو ضرور معین و مددگار ہوتی ہے' اس لیے ابتداءً کسی قوم کو بھی صرف و نحو مرتب کرنے کی ضرورت درپیش نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ ہر قوم نے اپنی اپنی زبان کی نحو و صرف ضرور مرتب کی ہے مگر تاریخ السنہ اقوام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا زمانہ دراز گزر جانے کے بعد کیا ہے۔ یونانیوں نے اپنی زبان کی نحو پانچویں صدی قبل مسیح میں مرتب کرنی شروع کی اور اس کا موجد پروٹوگورس تھا جس کی وفات ۴۱۱ قبل مسیح میں ہوئی۔ اسی طرح اہلِ روم نے بھی لاطینی زبان کی نحو اپنی ترقی کے وسطی زمانہ میں مدون کی اور اس کی تدوین کرنے والوں میں سب سے پہلے دیونسیوس کا نام لیا جاتا ہے۔ (جرجی زیدان) اس کے برخلاف اہلِ اسلام

نے عربی کی نحو اپنے تمدن کے ابتدائی زمانہ میں ہی مدون کر لی اور اس کی تدوین میں بھی انہوں نے زیادہ وقت نہیں لگایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ قرآن پاک جو مسلمانوں کی سچی مذہبی کتاب ہے اور جس پر بلاشبہ ان کے دین و دنیا کا دارومدار ہے، عربی زبان میں ہے اور اسلام بہت جلد حدود عرب کو عبور کر کے مصر و ایران اور روم و اسپین تک پہنچ گیا۔ دیگر قومیں جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگیں، اس لیے اسلام کی تعلیم حاصل کرنے اور قرآن کو سمجھنے کے لیے وہ عربی زبان حاصل کرنے کی طرف راغب ہوئیں۔ ویسے بھی عرب و عجم کا جب اختلاط ہوا تو لسانی غلطیاں بکثرت ہونے لگیں۔ خود اہلِ عرب اپنے وطن سے دور رہنے کی وجہ سے بلکہ خود اپنے وطن ہی میں اس اختلاط کی وجہ سے خطاء لفظی و اعرابی کا شکار ہونے لگے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ زیاد بن ابیہ کے پاس ایک شخص شکایت لے کر آیا۔ دورانِ کلام اس نے ایک غلط جملہ یہ بولا: "توفی ابانا وخلف لنا بنون۔" (صحیح جملہ یہ تھا: توفی ابونا وخلف لنا بنین۔ ہمارے باپ نے وفات پائی اور اس نے اپنے پیچھے لڑکے چھوڑے ہیں) یہ غلط فقرہ سن کر زیاد کو خیال ہوا کہ زبان واقعی خراب ہوتی جاتی ہے، اس لیے اس نے ابوالاسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور کہا کہ میں نے تم کو منع کیا تھا مگر اب حکم دیتا ہوں کہ زبان کے قواعد مرتب کرو۔ (المزہر ص ۱۹۹ ج ۲)۔

اسی طرح کے اور بھی بعض واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کا حاصل یہی ہے کہ اس زمانہ میں زبان میں سقم اور بہت کچھ غلطیاں پیدا ہونے کی ابتدا ہو چکی تھی، اس لیے حضرت ابوالاسود دوائلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عربی زبان کی نحو مرتب کی۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اس کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سیکھا اور انہیں کے ارشاد کے مطابق مرتب کیا۔ رفتہ رفتہ اس میں تحقیقات ہوتی گئیں یہاں تک کہ مستقل علم بن گیا۔ نحو کی بنیاد گو حضرت ابوالاسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکھی لیکن اس کی تکمیل سیبویہ نے کی جو اس فن کا مسلم امام تھا۔ اس نے اس فن میں ایک کتاب بھی تصنیف کی جو عندالکل مستند مانی جاتی ہے اور جو بطور ہدیہ شاہان کی خدمات میں پیش کی جاتی تھی۔ وہ "الکتاب" کے نام سے موسوم ہے۔ درحقیقت اس کتاب کے بعد جتنی کتابیں

بھی اس موضوع پر لکھی گئیں وہ اسی سے ماخوذ ہیں۔ سیبویہ کی وفات ۱۸۰ھ میں ہوئی۔

اس طرح تفسیر قرآن کے لیے بھی معانی الفاظ کو بیان کرنے کی ضرورت درپیش ہوئی۔ مسلمانوں نے اس علم کو بھی تشنہ تکمیل نہ رکھا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت دشت و جبل میں گشت کرتی تھی جو عربوں کے اشعار، امثال اور محاورات اور ان کی گفتگو سے الفاظ کے معانی اور اسالیب تراکیب کا اقتباس کرتی تھی۔ دراصل اسی علم کو بشمول صرف و نحو علم ادب کہتے ہیں۔ وہ قبائل جن سے عربی زبان کا لغت مدون کیا گیا بنی قیس، بنی تمیم اور اسد ہیں۔ الفاظ غریبہ اور اعراب و تصریف میں بھی یہی قبائل مستند مانے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر قبائل کی زبان کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ چونکہ ان کا میل جول مصری، شامی، نبطی قبائل اور اقوام ہند و ایران میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ تھا جس کی وجہ سے ان کی زبان خالص اور بے میل نہیں رہی تھی۔ جن لوگوں نے معانی الفاظ قبائل مذکورہ سے تحقیق کیے وہ زیادہ تر اہلِ بصرہ ہیں۔ انہی لوگوں کی جدوجہد اور انتھک کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ ایک مستقل علم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ بعد میں یہی لوگ اس میں زیادہ مشغول رہے۔ اہلِ کوفہ نے بھی اس فن کی ترقی میں کافی دلچسپی لی۔

اگر ہم یہ کہیں کہ اہلِ کوفہ و اہلِ بصرہ اس علم میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے تو غلط نہ ہوگا لیکن اس امر میں جو اہمیت اہلِ بصرہ کو حاصل تھی وہ اہلِ کوفہ کو نہ تھی۔ اس سلسلہ میں ہم اہلِ بصرہ و کوفہ کے چند ادباء کا ذکر کریں گے جو اس علم کے ستون ہیں اور جو عندالکل مسلم امام فن ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا شخص ابو عمرو بن العلا ہے۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ۱۵۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے فصحاء عرب کے اقوال اتنی بڑی تعداد میں جمع کیے کہ ان کا مکان چھت تک بھر گیا۔ (ابن خلکان ج۱) اور اس کے باوجود ان کا بیان ہے کہ میں نے جو کچھ جمع کیا ہے وہ کلام عرب کا ایک بے مقدار حصہ ہے۔ ابو عبیدہ، ابو زید انصاری اور اصمعی نے علم لغت و نحو و صرف شعر اور قرأت اسی سے حاصل کی تھیں۔ (المزہر ج۲)

ابو زید انصاری

یہ کوفہ کے مشہور ترین علماء میں سے ہیں۔ رواۃ حدیث میں بھی ان کا شمار ہے۔ یہ نہایت ثقہ، معتبر اور پرہیزگار تھے۔ ان کی لغت دانی مسلم تھی۔ سیبویہ نے یہ علم ان ہی سے حاصل کیا۔ ۲۱۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

ابو عبیدہ (متوفی ۲۰۹ھ)

عرب کے واقعات، محارب اور اخبار کا کامل علم رکھتے تھے۔ انہوں نے اقوال و علوم کو سب سے زیادہ جمع کیا۔ ان کا مقولہ تھا کہ "جو دو سوار کہیں ملے ہوں خواہ وہ زمانہ جاہلیت میں یا زمانہ اسلام میں، میں ان کے حالات سے واقف ہوں گا۔"

اصمعی

علم لغت کے ماہر تھے اور عرب کے امثال و اشعار پر عبورِ تام رکھتے تھے۔ انہوں نے ۲۱۲ھ میں وفات پائی۔

خلیل بن احمد

ان کا درجہ سب سے بلند تھا کیونکہ سب سے پہلے انہیں نے حروف معجم کے اعتبار سے لغت کی ایک کتاب مرتب کی اور اس کا نام "کتاب العین" رکھا۔

غرض دوسری صدی ہجری کے آخر اور تیسری صدی کے شروع میں بصرہ اور کوفہ میں نحاۃ، ادباء، شعراء، رواۃ اور حفاظ کی ایک خاصی بڑی تعداد ہو گئی لیکن اس سلسلہ میں بصرہ اقدم اور افضل خیال کیا جاتا تھا اور کوفہ کے علماء میں بجز ابو زید انصاری رضی اللہ عنہ دیگر علماء کو غیر محقق خیال کیا جاتا تھا۔ سیبویہ ان ہی کے تلامذہ میں سے تھے۔ کوفہ کے دوسرے مشہور علماء میں سے کسائی ہیں جن کی وفات ۲۰۸ھ میں ہوئی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد فراء ہوئے، اسی طرح اور بھی بہت سے مشہور علماء تھے۔ (طبقات الادباء ص ۱۷۵)

بغداد کے علماء میں عبداللہ بن سعید، ابوالحسن اخفش، ابو عکرمہ اور ابو عمر شیبانی مشہور ہیں۔ یہ سب فراء کے ہمعصر تھے۔ عباسی دورِ حکومت میں علم ادب منازل ترقی کے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ اس وقت چار کتابیں اس فن میں لکھی گئیں اور بڑے طویل زمانہ تک انہیں کتابوں پر اہلِ ادب کا دارومدار چلا آتا تھا۔ دوسری جتنی کتابیں بھی تصنیف کی گئیں ان سب کا ماخذ یہی کتابیں تھیں: (۱) ادب الکتاب مصنفہ ابن قتیبہ۔ (۲) کتاب الکامل مصنفہ مبرد۔ (۳) البیان والتبیین جاحظ۔ (۴) اور کتاب النوادر قالی کی۔

انشاء پردازی

اسلام سے پہلے عربوں کا رجحان شعر گوئی اور خطابت کی طرف تھا اور اس میں انہیں جس درجہ کمال حاصل تھا وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا۔ مضمون خواہ کتنا ہی سادہ ہوتا لیکن ان کا ہر شعر اور ان کی تقریر کا ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا۔ اپنی زبان اور اپنے بہترین ادب پر وہ اپنی زندگی کی ہر چیز قربان کرنے کے لیے آمادہ تھے، لیکن انشاء پردازی کی طرف ان کا میلان طبع زیادہ نہ تھا اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے جملہ امور عام طور سے زبانی پیغام رسانی، خطابت اور شعر ہی کے ذریعہ سے پورے ہو جاتے تھے۔ اس لیے انشاء پردازی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن اسلام کی ترقی کے بعد جب وہ مختلف ممالک میں پھیل گئے تو انہیں اس امر کی بھی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور جودت طبع کی بدولت انشاء کے میدان میں بھی وہ ترقی کی کہ دیگر اقوامِ دنیا کی ترقی اس کے مقابلہ میں گرد ہو کر رہ گئی۔ ویسے تو مضمون و انشاء کو فصیح و بلیغ بنانے کا خیال ہر قوم کو ہوتا ہی ہے لیکن عربوں کا یہ ذوقِ حدِ جنون تک پہنچا ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی وہ برتر فطرت تھی جو دیگر اقوام کے مقابلہ میں ان کو ملی تھی۔ وہ فصیح و بلیغ کلام سے جس درجہ متاثر ہوتے تھے اتنا اثر ان پر کسی اور چیز کا نہ ہو سکتا تھا، دوسرے یہ کہ قرآن کریم کی انشاء اور پُرمغز و فصیح و بلیغ عبارت نے انہیں خاص طور سے متاثر کیا۔ قرآن کریم مسلمانوں کی مقدس

ترین مذہبی کتاب ہے جس نے اہلِ عرب کے سامنے انشاء عبارت کا وہ انوکھا و اچھوتا انداز بیان پیش کیا کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ نئی نئی تراکیب، بہتر سے بہتر اسالیب، اعلیٰ ترین استعارات و کنایات، عجوبہ روزگار تشبیہات و تمثیلات اور اداء معانی و افہام مطالب و مقاصد کے لیے بہترین اور دلنشیں طریقے، قرآن پاک کی ان تمام خصائص سے وہ بے حد متاثر ہوئے یہاں تک کہ نزول قرآن کے بعد ان کی انشاء نے بالکل نیا رنگ اختیار کر لیا۔ ان کے گلشن ادب میں تازہ بہار آگئی اور عجیب عجیب گلہائے رنگا رنگ اور غنچہ ہائے نازک و حسین نظر آنے لگے۔

انشاء پردازی کی ابتداء ان کے یہاں ہمیں خطوط سے ملتی ہے جس میں خلفاء کے وہ فرامین و توقیعات بھی شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً کسی ضرورت سے عمال کی طرف بھیجا کرتے تھے اور اس کی انتہا بہترین ادب، تاریخ اور جملہ علوم ادبیہ پر ہوتی ہے۔ اوائلِ ایام میں اہلِ عرب اپنے فطری تقاضا و مذاق کی وجہ سے نہایت اختصار پسند تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو کم سے کم ہوں لیکن جو زیادہ سے زیادہ معانی پیدا کریں، اسی لیے ان کا یہ مشہور مقولہ ہے:

خیر الکلام ما قل ودل۔ طویل مفہوم اور کثیر معانی کم سے کم جامع و مختصر الفاظ میں بیان کیے جائیں، یہی بہترین کلام کہلایا جا سکتا ہے۔

یہ اسلوب بیان انہیں خاص طور سے قرآن کریم اور احادیث نبوی نے سکھایا تھا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے خصائص میں سے آپ کا جوامع الکلم ہونا بھی تھا یعنی آپ کا کلام نہایت مختصر، جامع اور بے حد پُر مغز و معنی خیز ہوتا تھا اور قرآن کریم کی اعلیٰ اور ممتاز ترین خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ نہایت چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے سے بڑے مطلب اور مفہوم کو ادا کر جاتا ہے اور پھر اتنا پُر اثر ہوتا ہے کہ براہ راست قلب سے ٹکراتا ہے۔ اس تاثر و انفعال کا اثر یہ تھا کہ خلفاء کے جتنے بھی خطوط و توقیعات ملتے ہیں وہ سب نہایت مختصر ہیں۔ ان مختصر اور بلیغ ترین خطوط و توقیعات کے سلسلہ میں ہم چند خطوط کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں سب سے پہلے ہم وہ خط پیش کرنا چاہتے ہیں جو خلیفہ دوئم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے والی مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا ہے۔ اس وقت مصر قحط کے تباہی خیز طوفانوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس خط کے الفاظ یہ ہیں:

من عبداللہ عمر الی عمرو بن العاص سلام علیک اما بعد فلعمری یا عمرو ما تبالی اذا شبعت انت ومن معک ان ھلکت انا ومن معی فیا غوثاہ ثم یا غوثاہ۔	خدا کے بندے عمر کی جانب سے عمرو بن العاص والی مصر کی طرف تم پر سلامتی ہو۔ اے عمرو! اگر تیرا اور تیرے ساتھیوں کا پیٹ بھرا رہے گا تو تجھ کو میرے اور میرے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کی کچھ فکر نہ ہوگی۔ الغیاث الغیاث۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا جو کچھ جواب دیا وہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے:

من عمرو بن العاص الی عمر امیر المومنین اما بعد فیا لبیک ثم یا لبیک قد بعثت الیک بعیرا اولھا عندک وآخرھا عندی والسلام علیک ورحمہ اللہ وبرکاتہ۔ (تاریخ الادب العربی)	عمرو بن العاص کی جانب سے امیر المومنین عمر کی خدمت میں۔ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔ اتنے اونٹ بھیجتا ہوں کہ ان کا پہلا حصہ آپ کے پاس ہے اور آخری حصہ میرے پاس ہے۔ والسلام۔

ایسا ہی وہ خط مشہور ہے جو حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان خلیفہ بنی امیہ کے پاس بھیجا تھا جبکہ بیت المقدس کا وہ دروازہ جو عبدالملک کا تعمیر کردہ تھا بجلی گر جانے سے منہدم ہو گیا تھا اور حجاج کا تعمیر کردہ دروازہ باقی رہا۔ ہارون الرشید خلیفہ عباسی کا وہ خط بہت مشہور ہے جو اس نے شاہ روم کے خط کے جواب میں لکھا تھا جس کو پڑھ کر شاہ روم لرزہ براندام ہو گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا خلیفہ مامون الرشید بھی نہایت فصیح و بلیغ اور بہترین انشاء پرداز تھا۔ (تاریخ تمدن اسلامی)

اس وقت تک جملہ مراسلات، مکاتیب اور فرامین شاہی کی خصوصیات یہی تھیں کہ وہ نہایت مختصر، فصیح و بلیغ اور جامع ہوتی تھیں اور یہ سب کچھ براہ راست قرآن و حدیث کا اثر تھا۔ توقیعات و فرامین نویسی اہلِ عرب نے خاص طور سے ایرانیوں سے اخذ کی تھی لیکن ان توقیعات میں حسب موقع و محل قرآنی جملوں اور حدیث کے ٹکڑوں سے جو جان پڑتی تھی اور یہ جتنے شیریں ہو جاتے تھے وہ اہلِ ایران کو نصیب نہ تھی۔ عرصہ دراز تک اہلِ عرب ایجاز و اختصار کو بلاغت کی جان تصور کرتے رہے لیکن جب ایرانی عنصر عربوں سے ملا، پھر عربی انشاء کی صورت ہی بدل گئی۔ اس کے بعد عربوں کے اندر تفخیم اور مبالغہ آمیزی بھی آ جاتی ہے۔ اب عبارت آرائی کا سلسلہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے جس شخص نے عبارت آرائی سے کام لیا وہ مشہور انشاء پرداز عبدالحمید شامی متوفی ۱۳۴ھ تھا۔ (ابن خلکان ص ۳۰۷ ج ۱)

اس کے بعد دوسروں نے بھی اس کا نقش قدم اختیار کیا اور یہی طرز تحریر شرف قبولیت اختیار کرنے لگا لیکن یہ طرز و طریقہ عربوں کی فطرت کے خلاف تھا اسی لیے اس میں جن لوگوں نے مہارت و کمال حاصل کیا وہ اکثریت کے ساتھ غیر عرب ہیں جن میں امراء، وزراء سب ہی شامل ہیں۔ ان میں سے یحییٰ بن خالد برمکی، فضل بن ربیع، فضل بن سہیل، صاحب بن عبادہ، ابن الحمید خراسانی اور عماد الدین کاتب خاص طور سے مشہور ہیں اور ان میں سے بنی آخر الذکر اس فن میں طاق تھا اور اعلیٰ درجہ کی عبارت آرائی کرنے میں یکتا و بے نظیر تھا۔ (علوم عرب جرجی زیدان)

عربوں کو شاعری و شعر سے جو شغف تھا وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ شعر ہی ان کی زندگی تھی اور شعر ہی ان کی غذا۔ اس دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تمدن کے زمانہ عروج میں ادباء و شعراء کی کثرت ہو گئی اور اشعار سے اس درجہ دلچسپی لی جانے لگی کہ ہر طبقہ کے لوگ اپنی روزمرہ گفتگو میں بلاتکلف اشعار پڑھتے تھے۔ انہیں وہ کلام ہی پھیکا معلوم ہوتا تھا جو شعر سے خالی ہو۔ امثال و اشعار کے استعمال میں انہیں خاص قسم کی لطافت محسوس ہوتی تھی۔ عوام اپنے خطوط و مکاتیب میں بھی ان کا استعمال کرتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ نثر میں بھی سجع و قافیہ کا استعمال شروع ہو گیا۔ چونکہ یہ عجیب چیز تھی

اس لیے ابتداءً بہت پسند کی گئی اور عوام اس سے بہت زیادہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس وجہ سے بہت جلد اس نے قبولیت حاصل کر لی یہاں تک کہ تصنیفات میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ سب سے پہلے بدیع الزماں ہمدانی متوفی ۳۹۸ھ نے اپنے مقامات کو مقفیٰ و مسجع عبارت میں لکھا۔ اس نے غالباً احمد بن فارسی رازی سے یہ چیز حاصل کی تھی جس کی وفات ۳۹۰ھ میں ہوئی۔ (ابن خلکان ص ۵۳-۳۹ ج ۱)

اس کی پیروی حریری نے کی اور اپنے مقامات کو مقفیٰ لکھا لیکن اسے وہ چیز میسر نہ ہو سکی جو ہمدانی کو تھی۔ حریری کی پیدائش ۴۵۰ھ میں اور وفات ۵۱۶ھ میں ہوئی۔ ہمدانی اور حریری کے مقامات اگرچہ قطعاً فرضی واقعات پر مبنی ہیں لیکن یہ ادب کی جان ہیں۔ آگے چل کر انشاء پردازی کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی کی بنیاد ہے۔ ان دونوں مقالات کا اثر یہ ہوا کہ ہر شخص مقفیٰ و مسجع کلام کرنے کی کوشش کرتا تھا اور دماغ اس سے اتنے اثر پذیر تھے کہ مورخوں نے تاریخ کی عبارتیں بھی مقفیٰ و مسجع لکھنا شروع کر دیں۔ چنانچہ قلائد العقبان مصنفہ فتح بن خاقان اور تاریخ آل سلجوق اور فتح القس فی الفتح القدس مصنفہ عماد الدین اصفہانی کی عبارات مقفیٰ و مسجع ہیں۔ (جرجی زیدان، تمدن اسلام) لیکن یہ طرز تحریر تاریخ کے لیے سازگار نہ ہو سکا اور بہت جلد ناکام ہو گیا نہ اسے عوام ہی نے قبولیت کی نگاہ سے دیکھا۔ بڑے بڑے مورخین مثلاً ابن خلدون، ابن اثیر اور مسعودی وغیرہ نے نہ صرف یہ کہ اس کی پابندی نہ کی بلکہ علامہ ابن خلدون نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "سجع ملکہ انشاء کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔" (ابن خلدون ص ۴۹۸ ج ۱)

عربوں کی تصنیفات

رفتہ رفتہ عربوں کی توجہ تصنیفات کی طرف ہوئی۔ یہ مختلف قسم کی ہیں: ادبی، علمی اور تاریخی۔ اور اسی لحاظ سے ان کی لسانی حیثیات بھی مختلف ہیں۔ علمی اور تاریخی تصنیفات میں فصاحت و بلاغت کا زیادہ خیال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بالکل ہی خیال نہیں کیا جاتا تھا تو زیادہ صحیح ہو گا لیکن ادبی تصنیفات ان کے بغیر بے جان خیال کی جاتی تھیں کیونکہ ان کتابوں کا مقصد ہی یہی ہوتا تھا کہ لسانی خوبیوں کا زیادہ سے زیادہ

اظہار کیا جائے۔ جب تک ان میں تخیلات شاعرانہ کی جادو بیانی، کنایات و استعارات کی چاشنی اور تراکیب کی چستی اور اچھوتے اسالیب نہ ہوں وہ بیکار و بدمزہ تصور کی جاتی تھیں اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں، اسی لیے ہر قوم کے ادب داں و ادب نواز طبقہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ زبان کے ادب کا زیادہ سے زیادہ گہرا مطالعہ کرے تاکہ اس کے اندر زبان و ادب کا ذوق صحیح پیدا ہوسکے۔ خاص طور سے عربی ادب کے لیے تو یہ چیز اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ بغیر اس کے نہ وہ لطافت کلام کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اسالیب و تراکیب پر وقوف حاصل کر سکتا ہے اور جب ان ہی سے واقفیت نہ ہو تو پھر ادب سے لذت یاب کیسے ہو سکتا ہے، لیکن ادبی تصنیفات کے علاوہ دیگر علوم کے لیے فصاحت و بلاغت ضروری نہیں ہے، اسی لیے فقہاء، فلاسفہ اور اہلِ طبیعیات و مورخین ان علوم کی تصانیف میں اس کا مطلقاً استعمال نہیں کرتے تھے کیونکہ اگر وہ عبارت آرائی، ادبیت اور فصاحت و بلاغت سے کام لیتے تو ان کے لیے اپنا مقصد سمجھانا دشوار ہو جاتا اور تصنیف کا مقصد حاصل نہ ہو سکتا۔ اسی زمانہ میں علم ادب میں جس قدر تصانیف ہوئی تھیں وہ مصنف کی اپنی ایجاد طبع نہیں ہوتی تھیں بلکہ زیادہ تر بلغاء عرب، خطباء اور شعراء وغیرہ کے اقوال مسلسل اسناد کے ساتھ روایت کیے جاتے تھے۔ تیسری صدی ہجری کے وسط تک اہلِ ادب نے جس قدر تصانیف کیں ان میں اہلِ عرب کے مرویات اور اقوال بیان کیے گئے ہیں۔ جاحظ، مبرد اور ابن قتیبہ وغیرہ کی کتابیں اسی قسم کی ہیں۔ ان کتابوں کی حالت بعینہٖ مغازی، فتوح، سیر اور اشعار و اخبار جیسی ہے۔ حماد، اصمعی، ابو عبیدہ اور محمد بن اسحٰق وغیرہ جو اقوال بیان کرتے ہیں ان کو ان کے قائل کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے ہیں۔ ابن عبداللہ کی عقدالفرید اور ابوالفرح اصفہانی کی اغانی ایسی کتابیں ہیں جن میں مصنف کی اپنی بات بہت کم ملے گی اور جہاں کہیں ہے وہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا اپنا قول ہے۔ ابن المقفع کی کتاب کلیلہ و دمنہ اسلامی ادب میں عمدہ تصنیف کا پہلا نمونہ ہے جو اپنی دلچسپی، آسانی اور فصاحت وغیرہ کے اعتبار سے اپنے زمانہ کی تمام کتابوں سے ممتاز ہے۔ (جرجی زیدان)

لیکن تصنیف کا یہ طریقہ چھٹی صدی ہجری میں نابود ہوگیا اور اس زمانہ میں ہمیں اختصار

زیادہ نظر آتا ہے، اسانید و روایت کا پرانا طریقہ فنا ہو جاتا ہے۔

تاریخ

عربوں کو دو چیزوں کا بے حد شوق تھا: سیاحت اور اخبار ماضیہ کا علم۔ اوّل الذکر نے انہیں جغرافیہ و علم ہیئت سکھلایا جس میں انہوں نے بڑے بڑے انکشافات کیے اور دنیا کو اس سلسلہ میں بہترین مواد فراہم کیا جبکہ دوسرے شوق نے ان کو علم تاریخ سے روشناس کرا کر اس کی ایجاد کا سہرا ان کے سر باندھا۔ قوموں کی زندگی اور ان کی فنا و بقا میں تاریخ کو جو مقام حاصل ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل تاریخ ہی کسی قوم کے کیریکٹر کو بناتی ہے اور تاریخ ہی پر اقوام عالم کے عروج و زوال کا دارومدار ہے۔ جس قوم کے پاس اس کی تاریخ نہیں وہ نہ ترقی کے منازل طے کر سکتی ہے اور نہ اقوام و امم عالم میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل کر سکتی ہے، لیکن تاریخ عالم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم بھی رفتہ رفتہ وجود پذیر ہوا۔ ابتداءً جو واقعات ظہور میں آتے وہ سینہ بہ سینہ روایت کے ذریعہ سے نسلاً بعد نسل محفوظ چلے آتے تھے۔ اگرچہ پوری پوری احتیاط نہ ہونے کی وجہ سے ان میں بہت کچھ رطب و یابس اور خرافات و توہمات کا امتزاج ہو جاتا تھا جیسے ہندوؤں کی مہابھارت کی لڑائیوں، شاہنامہ ایران میں شاہان قدیم کے حالات و واقعات اور تاریخ یونان میں بتوں کے حالات میں ایسی بہت سی بے اصل و بے بنیاد چیزیں شامل ہو گئی ہیں۔ ایسا ہی حال عربوں کا بھی تھا۔ ان کے اخبار ماضیہ بھی ایسی خرافیوں سے بھرے ہوئے تھے جن میں بہت کچھ ضعف اعتقاد کو دخل تھا اور توہم پرستی کا اثر تھا۔

تاہم بہت سے واقعات ایسے بھی تھے جو اصل و حقیقت پر مبنی تھے جیسے عرب کی قدیم لڑائیاں، عام الفیل اور ایام العرب وغیرہ لیکن یہ ایک مسلم امر ہے کہ اہلِ عرب طلوعِ اسلام سے قبل بحیثیت تمدن کے تمام اقوام عالم میں نہایت درجہ ذلیل اور کمزور تھے، اس لیے ان کی کوئی خاص تاریخ بھی نہ تھی۔ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا ان کے پاس بجز توہمات اور نسب ناموں کے اور کچھ نہ تھا۔ دیگر اقوام کے حالات سے بھی ان کی

واقفیت کوئی قابلِ ذکر نہ تھی۔ احبار و رہبان سے وہ توراۃ و تلمود کے قصے سنتے چلے آئے تھے اور دنیا کے متعلق بس یہی ان کی معلومات تھیں لیکن جب اسلام کے نُور نے ان کے سینوں کو منور فرمایا اور اسلامی فتوحات نے ان کی ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تو انہوں نے دوسرے علوم کی طرح تاریخ کو بھی مدون کرنا شروع کیا۔ اگرچہ اہلِ عرب کی اپنی کوئی قابلِ ذکر تاریخ نہ تھی تاہم وہ تاریخ و اخبار ماضیہ کے شائق ضرور تھے۔ ان کو کسی علم سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ تاریخ سے۔ یہ کچھ تو ان کے فطری ذوق کی وجہ سے تھا اور کچھ اسلام نے ان کے اس ذوق کو نکھارا تھا، کیونکہ قرآن کریم میں بہت سی برباد شدہ اقوامِ تاریخی کا ذکر ہے۔ جابر و ظالم اور متمرد قسم کے شاہان کا تذکرہ ہے۔ انبیاء کے حالات ہیں، اسی طرح احادیث میں بھی بہت سی اس قسم کی تاریخی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ ان امور کی تحقیق کرنے کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ تاریخی چھان بین اور اس کی تدوین کریں۔

اس علم کے ساتھ ان کے امراء و حکمران طبقہ کو بھی خصوصی دلچسپی تھی جیسا کہ امیر معاویہ بن ابی سفیان، یزید بن معاویہ و دیگر خلفاء بنی امیہ، اسی طرح منصور عباسی، ہارون الرشید و مامون الرشید، بدرالدین لولوء وغیرہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تاریخ کے بے حد شائق تھے اور اس سے خاص شغف رکھتے تھے، یہاں تک کہ یہ مثل مشہور ہوگئی تھی کہ "بادشاہوں کا علم نسب و تاریخ ہے، سپاہیوں کا وقائع و سیر اور تاجروں کا حساب و کتاب۔"

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ تاریخ کی طرف عربوں کے رجحان کی ایک وجہ قرآن و حدیث کے بعض واقعات کی تحقیق بھی ہے، کیونکہ بغیر اس کے قرآن کریم کا سمجھنا ناممکن تھا اسی لیے انہوں نے سب سے پہلے سیرت نبوی کو جمع کرنا شروع کیا۔ سب سے اوّل خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ میں محمد بن اسحٰق متوفی ۱۵۱ھ نے منصور کے لیے "کتاب المغازی" مدون کی۔ بعض مورخین کا خیال ہے جیسا کہ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ محمد بن مسلم نے ۱۲۴ھ میں مغازی کو مدون کیا لیکن وفیات الاعیان کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ دونوں ہمعصر تھے۔

کشف الظنون کے مصنف ہی کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ سیرو مغازی پر اوّل ترین کتاب عروہ بن زبیر متوفی ۹۳ھ کی ہے۔ یہ تابعی ہیں، پھر اس فن میں وہب بن منبہ متوفی ۱۱۴ھ نے تصنیف کی۔ (کشف الظنون ص ۴۰۷ ج ۲)

یہ اس موضوع پر دوسری تصنیف تھی لیکن یہ تمام تصانیف یا تو نایاب ہیں یا پھر نادر الوجود۔ سیرو مغازی میں لکھی ہوئی سب سے پہلی تصنیف سیرۃ عبدالملک بن ہشام ہے جو سیرۃ ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی وفات ۲۱۳ھ میں ہوئی۔ ان کی یہ تصنیف سیرۃ ابن اسحٰق سے منقول و ماخوذ ہے۔ پھر اس موضوع پر بکثرت تصنیفات ہونے لگیں۔ بعض مورخین نے مخصوص خطے کی تاریخ مدون کی جیسے واقدی متوفی ۲۰۷ھ کی فتوح الشام اور ابن عبدالحکیم متوفی ۲۵۷ھ کی فتوح مصر والمغرب اور فتوح بیت المقدس وغیرہ اور بعض مورخین نے ان تمام فتوحات کو ایک ہی تصنیف میں جمع کر دیا جیسے بلاذری متوفی ۲۷۹ھ کی فتوح البلدان یا فتح الامصار اور ابن عساکر کی تاریخ دمشق جو آٹھ جلدوں میں ہے اور خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد وغیرہ۔

طبقات واسماء الرجال

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ احادیث کی صحت برقرار رکھنے اور ان کو ضعف اور اختلاط کذب و وضع سے محفوظ رکھنے کے لیے علماء کو اسانید کی ضرورت پڑی تاکہ ان سندوں کے ذریعہ سے وہ صحیح و ضعیف روایتوں میں امتیاز کر سکیں، اس لیے انہوں نے سب سے پہلے محدثین (حدیث بیان کرنے والوں) کے طبقات مقرر کیے جن میں پہلا طبقہ صحابہ، دوسرا تابعین، تیسرا تبع تابعین اور ان کے بعد علماء مرجحین و مجتہدین وغیرہ قرار دیئے گئے۔ پھر اس علم کی مزید توسیع کی گئی یہاں تک کہ شعراء، ادباء، فقہاء، نحاۃ، لغویین، مفسرین، حفاظ، متکلمین وغیرہم ہر قسم کے طبقات مقرر کر دیئے گئے۔ انہیں اس فن کا اس درجہ شوق ہوا کہ انہوں نے سواروں اور پیادوں کے طبقات کو بھی چھان بین سے نہ چھوڑا۔ اس تمام تحقیق کا مقصد متعلقہ علم خصوصاً علم حدیث کو دوسروں کی غلط بیانی سے محفوظ رکھنا تھا اور اس کی صورت یہ تھی کہ ایک حدیث کو فلاں نے روایت کیا

تو وہ اس کے ساتھ وہ واسطہ اور ذریعہ بھی بتلائے گا جس سے وہ حدیث اس بیان کرنے والے تک پہنچی ہے۔ مثلاً ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں تو وہ یہ کہیں گے کہ "میں نے یہ حدیث اپنے والد حضرت عباس سے اور انہوں نے حضرت عمر سے اور حضرت عمر نے رسول اللہ سے سنی۔ ان تمام درمیانی واسطوں میں (جس کو اسناد کہتے ہیں) اسماء الرجال یا طبقات کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ہر شخص کی شرعی حیثیت کیا ہے اور آیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی روایت کا اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ سے جن لوگوں نے حدیث کی روایت کی اور ان کے بعد زبانی روایت کے زمانہ تک جتنے واسطے آتے رہے' ان میں سے ہر ایک راوی کی مکمل سوانح حیات اسماء الرجال و طبقات میں بیان کی جاتی ہے۔ اسی طرح دیگر علوم کے طبقات کا حال ہے جن کا ذکر کیا گیا۔ اسماء الرجال عربوں کا وہ علم ہے کہ دیگر اقوام و ملل اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ عربوں نے کسی روایت کی صحت کو پرکھنے اور اس کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے اور اس سلسلہ میں جو محنت و جانفشانی کی ہے وہ صرف انہی کا حصہ ہے' ان سے پہلے نہ اس کی کوئی مثال ملتی ہے اور نہ ان کے بعد۔ اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مذہبی علوم مثلاً قرآن' تفسیر' فقہ اور حدیث وغیرہ بالکل محفوظ حالت میں ہیں۔

طبقات میں سب سے پہلی تصنیف طبقات الصحابہ ہے جو محمد بن سعد کی تصنیف کردہ ہے۔ یہ واقدی کے کاتب تھے اور ان کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی۔ یہ کتاب دس جلدوں میں ہے۔ اس میں صحابہ' تابعین اور زمانہ تصنیف تک کے خلفاء کا حال درج ہے۔ (ابن خلکان ص ۵۰۷ ج ۱) اس کی پوری جلدیں یورپ کے تمام مشہور کتب خانوں میں موجود ہیں اور جرمنی میں تو یہ چھاپی بھی جا چکی ہے۔ اس کے بعد اس فن میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ منجملہ ان کے اسد الغابہ فی احوال الصحابہ' اکمال فی اسماء الرجال' تہذیب التہذیب' ان میں سے آخری کتاب چوبیس ضخیم جلدوں میں ہے اور جس میں صحابہ' تابعین' تبع تابعین' ائمہ مجتہدین وغیرہ میں سے ہزارہا کی تعداد کے حالات درج ہیں۔ اس کے بعد ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ کی طبقات الشعراء ہے۔ پھر لوگوں نے مختلف

زمانوں میں اس فن میں بہت سی کتابیں لکھیں جیسے وفیات الاعیان، کتاب الوافی، فوات الوفیات وغیرہ۔ ازاں بعد اشخاص کی سیرت بھی لکھی جانے لگیں۔ بعض مصنفین نے صرف خلفاء راشدین کی سیرت لکھی اور پھر وزراء، امراء، قضاۃ، عمال و اذکیا اور حکام وغیرہ کی سیرتیں بھی لکھی گئیں۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ نویسی کا آغاز مغازی سے کیا۔ اس کے بعد طبقات اور سیر لکھیں اور پھر ان اقوام کی تاریخی چھان بین کی جن کا ذکر قرآن پاک نے کیا ہے جیسے قوم ثمود، قوم عاد، قوم عمالقہ اور فراعنہ وغیرہ۔ یہ دور دوسری صدی کے گزر جانے تک رہا۔ اس وقت تک انہوں نے دیگر اقوام و ملل کی طرف کوئی توجہ نہ کی لیکن دوسری صدی ہجری ختم ہونے کے بعد جب اہلِ عرب اپنی تاریخ مرتب کر چکے تو ان کی توجہ دیگر اقوام و ملل اور ممالک کی طرف بھی ہوئی۔ ابن واضح نے جو یعقوبی کے لقب سے مشہور ہے، دو جلدوں میں ایک تاریخ کی تدوین کی جس کی پہلی جلد میں اقوامِ قدیم یہود، ہنود، اہلِ یونان، اہلِ روم اور فارس وغیرہ کی تاریخ ہے اور دوسری جلد میں ابتدائی زمانہ اسلام سے معتمد باللہ عباسی تک کے حالات درج ہیں جو ۲۵۶ھ میں مسند خلافت پر بیٹھا۔

اس کے بعد ابن جریر طبری نے جو ایک مفسر بھی ہے "تاریخ طبری" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ یہ کتاب نہایت مبسوط اور ضخیم ہے اور اس میں ابن جریر نے واقعات کو سن وار ترتیب کے ساتھ مرتب کیا اور اس میں ۳۰۲ھ تک کے حالات و واقعات بیان کیے۔ ابن جریر کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔

ابن جریر کی کتاب کے بعد ہمیں مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کی کتاب "مروج الذہب" ملتی ہے جس میں تاریخی حالات کے علاوہ شہروں، دریاؤں اور حیوانات کے حالات کا بھی مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ابواب کی ترتیب دول و اقوام پر رکھی گئی ہے۔

۳۵۰ھ میں حمزہ اصفہانی نے "سنی ملوک الارض" کے نام سے ایک اور تاریخ مدون کی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی تاریخیں لکھی گئیں جن پر ساتویں صدی ہجری زوال

خلافت بنی عباس کے بعد تک تاریخ کا دارومدار رہا جبکہ کردوں، ترکوں اور بربریوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ ان نومولود حکومتوں کے زمانہ میں بھی مصنفین نے گزشتہ صدیوں کی تاریخ لکھنے کی طرف توجہ کی لیکن انہوں نے جتنی تاریخیں بھی لکھیں ان میں گزشتہ صدیوں کی تاریخ کا مآخذ یہی تاریخیں ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

البتہ بعد کے واقعات کا انہوں نے اپنی تاریخی تصانیف میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور اور قابلِ وثوق ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ کی "تاریخ الکامل" ہے۔ اس نے طبری کے تمام واقعات کی اسانید کو حذف کر کے اس میں بعد کے واقعات کا اضافہ کر دیا ہے۔

اس کے بعد ابوالفدا متوفی ۷۳۲ھ نے ابن اثیر کی "الکامل" کا خلاصہ کیا اور ادباء و علماء کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھے اور جاہلیت کے حالات میں بھی اضافہ کیا۔ الکامل کی بارہ جلدیں ہیں اور اس نے تین جلدیں لکھی ہیں۔ اس کے بعد عمرو بن وردی متوفی ۷۴۹ھ نے "تاریخ ابوالفداء" کا خلاصہ کیا۔

اس کے بعد علامہ ابن خلدون کا زمانہ ہے جن کی وفات ۸۰۸ھ میں ہوئی۔ یہ مسلم طور پر تاریخ کا امام ہے جس نے دنیا کو تاریخ لکھنا سکھایا اور فن تاریخ سے آشنا کیا۔ ابن خلدون سے قبل تاریخ لکھنے کا یہ طریقہ نہ تھا۔ نہ تاریخ نویسی کے کچھ اصول و قوانین تھے، نہ ہی اس کی اہمیت کا کوئی معیار۔ ابن خلدون نے فن تاریخ نویسی کے لیے کچھ اصول مرتب کیے اور ان ہی اصولوں پر اپنی تاریخ کو ترتیب دیا۔ اس کے بارے میں ایک عیسائی مورخ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ "یہ شخص بہت بڑا عالم، بڑا دقیق النظر، صحیح الفکر، محقق اور صاحب درایت تھا۔ اس نے اپنی تاریخ دول پر مرتب کی اور اس خوبی کے ساتھ جملہ واقعات خاص کر اندلس کے حالات کو لکھا جس کی نظیر مسلمانوں تو کیا یونانیوں اور اہلِ روم جیسی قدیم اقوام میں بھی نہیں ملتی۔ اس کی شہرت ایسی ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔"

بہ نسبت اور تاریخوں کے، تاریخ ابن خلدون اس لیے اور بھی ممتاز ہے کہ اس کے آغاز میں ایک نہایت مبسوط فلسفیانہ مقدمہ لکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس زمانہ کے علوم متداولہ پر اسے کس درجہ عبور حاصل تھا اور علمِ جغرافیہ کے بارے میں اس کی معلومات کتنی وسیع تھیں؟ اس کے ساتھ وہ انسابِ اقوام سے کس درجہ واقفیت رکھتا تھا؟ بلاشبہ وہ اعلیٰ دماغ کا مالک تھا اور غلط واقعات کے پرکھنے کی بڑی بصیرت اور ملکہ رکھتا تھا۔ ابن خلدون نے یہ تاریخ لکھ کر فن تاریخ کو نئی زندگی بخشی۔ دراصل وہ فن تاریخ کا عظیم مجدد ہے اور رہتی دنیا تک مورخین عالم اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کی عظمت کے سامنے آج بھی اہلِ یورپ سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ بلاشبہ ابن خلدون نے مورخین کو تاریخ نویسی کی نئی راہوں سے آشنا کیا۔ اس کے بعد اس فن میں وسعت پیدا ہوئی اور مورخین نے ایک ایک شہر کی الگ الگ تاریخ لکھنا شروع کی جس میں وہاں کے باشندوں اور حکمرانوں کا بھی ذکر ہوتا تھا جیسا کہ ہم تاریخ بغداد مصنفہ خطیب بغدادی اور تاریخ دمشق مصنفہ ابن عساکر کا ذکر کر چکے ہیں۔ ایسی ہی ابوالمحاسن اور سیوطی نے "اخبار مصر القاہرہ" وغیرہ تصنیف کیں۔

تراجم و سوانح حیات

طبقات میں شعراء و ادباء، علماء، حفاظ، محدثین اور فقہا وغیرہ کے حالات مدون کیے جا چکے تھے اور ہر فن و علم سے تعلق رکھنے والے علماء کا اپنے اپنے طبقہ میں ذکر کیا گیا تھا لیکن اب تک کسی کی علیحدہ اور مکمل سوانح حیات نہیں لکھی گئی تھی۔ بعد کو جب علماء نے ترتیب وار اور ابواب کے لحاظ سے کتابیں تصنیف کیں تو ان میں ایک طبقہ تراجم و سوانح حیات کی طرف متوجہ ہوا۔ انہوں نے طبقات سے تراجم کا انتخاب کیا اور جدت طبع و وسعت علم سے اس میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور "وفیات الاعیان" مصنفہ ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ ہے اور صلاح الدین کبتی متوفی ۷۶۴ھ کی "فوات الوفیات" ہے۔ ان کے علاوہ "کتاب الوافی" مصنفہ صلاح الدین صفدی متوفی ۷۶۴ھ اور "مرأۃ الزماں" مصنفہ سبط بن الجوزی متوفی ۶۵۴ھ بھی اس موضوع میں بہت مشہور ہیں لیکن یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ آخر الذکر کی چالیس جلدیں تھیں، ان میں سے بعض جلدیں یورپ کے کتب خانوں میں ملتی ہیں۔ ان کا ذکر مصری

مصنف جرجی زیدان نے کیا ہے۔

اہلِ اندلس کے تراجم میں "کتاب الصلہ" مصنفہ ابن بشکوال متوفی ۵۷۸ھ اور ابن الآبار کی "المعجم" بہت مشہور ہیں۔ ابن اثیر نے "اسد الغابہ فی احوال الصحابہ" پانچ جلدوں میں مرتب کی۔ اس کے علاوہ بھی رجال حدیث میں بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ افراد و رجال کے تراجم و سوانح ادب کی کتابوں میں بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً اغانی، کشکول، عقد الفرید، مستطرف اور البیان والتبیین وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض تاریخی حالات علم طبیعی میں بھی ملتے ہیں جیسے کتاب "حیاۃ الحیوان" مصنفہ دمیری میں ایسے تاریخی حالات ہیں جو دیگر تصانیف میں نہیں ملتے۔

اسلام سے قبل عربوں کی تاریخی حیثیت جو کچھ بھی تھی وہ بیان کی جا چکی ہے یعنی نہ ان کی کوئی تاریخ تھی اور نہ انہیں تاریخ لکھنے کا کوئی سلیقہ تھا۔ ایران، یونان اور روم وغیرہ کی اپنی اپنی تاریخیں تھیں لیکن عرب اس بارے میں بہت ہی پسماندہ تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد جب انہوں نے اس طرف توجہ کی تو اپنی فطری ذہانت و ذکاوت طبع سے اس میدان میں بہت جلد ترقی کر لی اور ایسی ایسی شاخیں نکالیں جن کی طرف کسی کا وہم و خیال بھی نہ پہنچا تھا۔ اس فن میں انہوں نے اس کثرت اور جامعیت کے ساتھ تصانیف کیں کہ دیگر اقوام ان کے سامنے گرد ہو گئیں۔

فن تاریخ میں تراجم و سوانح حیات انہیں کی ایزاد و ایجاد ہے۔ ایک ایک کتاب میں ہزار ہزار اور دو دو ہزار افراد تک کے تراجم ہیں اور بعض بعض میں اس سے بھی زیادہ۔ ان کی تاریخی تصنیفات تاریخ کے علاوہ جغرافیہ، ادب اور علم کا بھی خزانہ ہیں۔ ان کتابوں میں سے بعض کی ترتیب حروف تہجی پر ہے جیسے طبقات الشعراء، طبقات الفقہاء، طبقات الاطباء وغیرہ۔ آخر الذکر کتاب طب اور اطباء، علم اور علماء، فلسفہ اور فلاسفہ اسلام، فلاسفہ فارس و ہند و یونان و کلدان وغیرہ کی جامع اور مبسوط تاریخ ہے۔ اس کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے ہے اور اس کا مصنف ابن ابی اصیبعہ ہے جس کی وفات ۶۶۸ھ میں ہوئی۔ اس کتاب میں علماء و حکماء وغیرہ کی تمام تصانیف، اخلاق اور آداب کا

مشرح تذکرہ ہے۔

اسماء الرجال کی کتابوں کی ترتیب عموماً طبقہ وار ہے جن میں پہلے طبقہ اولیٰ پھر طبقہ ثانیہ اور طبقہ ثالثہ کے تراجم کا بیان ہے۔ ان کتابوں میں ہر فرد کا سن ولادت، سن وفات، مقام پیدائش، مقام وفات اور نام و نسب وغیرہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ زور اس امر کو واضح کرنے پر دیا گیا ہے کہ متعلقہ فرد کس معیار اور کس کردار کی شخصیت ہے۔ تہذیب التہذیب اور اسد الغابہ وغیرہ اسی قسم کی تصانیف ہیں۔

مسلمانوں نے تاریخ میں اس کثرت سے کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا شمار و احاطہ مشکل ہے۔ عروجِ اسلام سے قبل کسی قوم نے تاریخ نویسی میں وہ درجہ حاصل نہیں کیا جو عربوں کو قبولِ اسلام کے بعد حاصل ہوا۔ اب بھی وہ بعض چیزوں میں اس ترقی یافتہ دور کی اقوام اور ازمنہ ماضیہ کی اقوام سے ممتاز ہیں جیسے علم اسماء الرجال وغیرہ کہ یہ علم صرف عربوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اہلِ یورپ یا دیگر اقوام نے سوانح حیات میں جو کچھ تصانیف کی ہیں وہ عربوں کی نقل ہے۔ عربوں نے ہی اس علم کو ایجاد کیا اور عربوں نے ہی اسے بامِ عروج پر پہنچایا۔

اسی طرح افراد کی زندگی کو ناقدانہ طور پر پرکھنا بھی عربوں کی جرأت مندانہ خصوصیت تھی جو دیگر اقوام میں مفقود ہے۔ پھر انہوں نے اس کثرت سے کتب تاریخ تصنیف کیں جو حیطہ شمار سے باہر ہیں۔ اس فن میں انہوں نے کس قدر تصنیفات کی ہیں اس کی تعداد بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ لیکن صاحب کشف الظنون نے جس قدر نام نقل کیے ہیں وہی تیرہ سو سے زائد ہیں۔ یہ صرف دسویں صدی سے پہلے کے ہیں اور ان میں اکثر کتابوں کی کئی کئی جلدیں ہیں۔ بعض بعض تو چالیس چالیس اور اسی اسی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ شروح اور خلاصے ان کے علاوہ ہیں۔

بعض محققین کا بیان ہے کہ اس مصنف یعنی صاحب کشف الظنون نے جن کتابوں کے نام چھوڑ دیئے ہیں ان کی تعداد اس کے کئی گنا زیادہ ہے۔ اگر آج وہ تمام کتابیں باقی ہوتیں تو ان کی تعداد کئی ہزار سے بھی زیادہ ہوتی۔ عربوں کا ایک اور امتیاز اس فن میں یہ ہے کہ ان کی تاریخی تصانیف کی جو وقعت و اہمیت اور ان کا جو وزن اور

اعلیٰ معیار ہے وہ بھی کسی دوسری قوم کو نصیب نہ ہو سکا۔ انہوں نے روایات و واقعات کی تحقیق میں جو جدوجہد اور محنت کی اس چیز نے ان کی تاریخوں کے درجہ اعتبار کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ مورخ ہو یا راوی، وہ لوگ اس کی بات پر اس وقت تک اعتماد نہ کرتے تاوقتیکہ اس کی صداقت، دیانت اور راست بازی ان کے لیے ثابت نہ ہو جائے۔

ایک عیسائی مورخ کا بیان ہے کہ "مسلمان مورخوں کی روایات معتبر، مستند اور نہایت قابلِ وثوق ہوتی ہیں کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور سچ بولنا ان کی عادت میں داخل ہے۔ ان کی تمام تصنیفات صداقت سے مملو ہیں کیونکہ عربوں نے اپنی سادگی کبھی نہیں چھوڑی اور ان میں بناوٹ اور جھوٹ کبھی نہیں آیا۔" (جرجی زیدان)

لیکن زوالِ اسلام کے بعد جب علم تاریخ کی طرف دیگر اقوام متوجہ ہوئیں تو انہوں نے روایت کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور راوی و مورخ کی صداقت و دیانت کی طرف سے بالکل قطع نظر کر لیا۔ یہ بات خاص طور سے اہلِ یورپ میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ انہوں نے دولِ اسلام کے بارے میں جتنی بھی تصنیفات کیں ان میں یہ بات خاص طور سے نمایاں ملے گی کہ انہوں نے صداقت کے مقابلہ میں خواہش نفس کو ہمیشہ ترجیح دی اور اسلام کے ساتھ فطری تعصب اور عداوت نے انہیں ہمیشہ صحیح بات کہنے سے باز رکھا۔ اگر وہ بھی اپنی تاریخوں میں واقعات کے ساتھ اسناد و راوی کو بیان کرتے تو کسی نہ کسی طرح یہ ضرور معلوم ہو سکتا تھا کہ ان کے بیان میں صداقت کتنی ہے اور کذب بیانی کتنی۔ اہلِ یورپ کی تاریخ نویسی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ راوی یا کسی دوسرے مورخ کی زبان سے نہیں بلکہ خود اپنے مشاہدات بیان کر رہے ہیں، اسی وجہ سے ان کی اکثر بلکہ تمامتر تواریخ اس قسم کی لغو و بے سروپا باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ وہ ہمیشہ تاریخ کو تاریخ کے لیے نہیں بلکہ اپنے مخصوص مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے رنگ آمیزی کر کے لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو تاریخ صداقت و واقعیت کو نظر انداز کر کے لکھی جائے گی اس میں حقیقت کو دخل کہاں تک ہو گا۔

جغرافیہ

اس علم کا آغاز براعظم افریقہ کے علاقہ فینیشیا سے ہوا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اہلِ فینیشیا نے سب سے پہلے تجارت شروع کی اور اسی قوم نے سب سے پہلے سیاحی بھی شروع کی۔ یہ بحرابیض کے سواحل تک پہنچی اور وہاں جاکر آباد ہوئی۔ اپنے ان تجارتی اسفار کی وجہ سے اس کو دنیا کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوگئیں تھیں اور اکثر ممالک و مقامات اور شہروں کے راستوں اور فاصلوں سے بڑی حد تک واقفیت ہوگئی تھی۔ اسکندر اعظم نے جب اپنی بہادر فوجوں کے ساتھ سرزمین ایشیا پر یلغار کی اور وہ ایران کو فتح کرتا ہوا بلاد ہند تک پہنچا تو اس کے فوجی ایشیا کے حالات سے کافی واقف ہوگئے اور اپنے ملک واپس ہونے کے بعد انہوں نے جملہ حالات قلمبند کرلیے۔ خاندان بطلیموس (جو مصر کے حکمران تھے) نے سواحل بحراحمر کے حالات مع ملک حبشہ وغیرہ کے لکھے اور رومیوں نے اپنی معلومات سے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا۔

یہ علم اپنی اسی منتشر حالت میں تھا کہ سب سے پہلے اسے ترتیب دینے کا خیال بھی ایک یونانی ہی کو ہوا جس کا نام اراٹسٹین متوفی ۱۹۶ق۔م ہے۔ اس کے بعد اترابون پھر بینوس وغیرہ جغرافی ہوئے جو اپنے زمانہ کے سیاح بھی تھے۔ آخرالذکر زمانہ بطلیموس ۵۰ء میں ہوا۔ اس نے علم جغرافیہ میں ایک بہترین تصنیف کی جس میں فلکی حساب سے مقامات اور راستے مقرر کیے۔ اس میں اس نے چار ہزار تین سو پچاس (۴۳۵۰) شہروں کے نام درج کیے ہیں۔ پہاڑوں کی تعداد دو سو (۲۰۰) لکھی ہے اور دیگر حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ زمانہ اسلام تک علم جغرافیہ میں اسی کتاب پر انحصار و دارومدار تھا۔ عربوں نے جب دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمے کرائے تو اس کتاب کا بھی ترجمہ کرالیا اور اس کا نام جغرافیہ رکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب پر مطلع ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں نے جغرافیہ کی ابتدا کر دی تھی۔ (موسیو لی بان) اور اس کے مختلف وجوہ و اسباب تھے۔ یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اہلِ عرب بہت اچھے ستارہ شناس تھے، وہ ستاروں کے ذریعہ سے کسی مقام کی سمت ہی نہیں معلوم کرلیتے تھے بلکہ جائے وقوع کا علم بھی

حاصل کر لیتے تھے، اس لیے علم جغرافیہ سے ان کی طبیعت پہلے ہی سے کافی حد تک مانوس و مناسب تھی۔

ظہورِ اسلام کے بعد جب فتوحات و تجارت کو فروغ حاصل ہوا تو ان دونوں اسباب نے ان کو اس علم کی طرف اور بھی مائل کر دیا۔ ان کے اس علم کی طرف راغب ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان دور دراز ملکوں میں پھیل چکے تھے اور فریضہ حج ادا کرنے کے لیے ان کی آمدورفت ضروری ہے، اس لیے ضروری تھا کہ انہیں مقامات اور راستوں کا علم ہو اور فاصلے بھی معلوم ہوں۔ علاوہ ازیں طلب علم میں بھی انہیں سفر کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ تمام اسلامی ممالک میں علم اور علماء کی تلاش میں سفر کرتے رہتے تھے، اس کے لیے بھی شہروں کی سمت، جائے وقوع، فاصلے اور راستوں کا علم ضروری تھا اور ویسے بھی عرب ہمیشہ سے نہایت دلیر جہاز راں تھے اور بعد مسافت سے کبھی خائف نہیں ہوئے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ انہیں سیاحت کا بھی بے حد شوق تھا، اسی تجارت و سیاحت کی بدولت انہوں نے اپنی ابتداء حکومت کے زمانہ میں ہی دور دور ملکوں کے ساتھ جہاں اہلِ یورپ کے خیال کا بھی گزر نہ تھا مثلاً چین، روس کے بعض حصے اور افریقہ کے بعض نامعلوم حصوں سے تجارتی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ چنانچہ چین کے متعلق معلومات اہلِ یورپ کو عربوں کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوئیں۔ چوتھی صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی میں سلیمان نامی ایک عربی تاجر نے چین کا سفر کیا۔ یہ سفر ۸۵۱ھ سے پہلے کیا گیا لیکن اس کا سفرنامہ اس کے ایک ہم سفر ابوزید نے ۸۸۰ھ میں مرتب کیا جس میں چین کے متعلق اور عرب سیاحوں کی تحقیقات کو بھی درج کیا۔ سلیمان کا سفرنامہ پہلی کتاب ہے جو یورپ میں چین کے بارے میں مشہور ہوئی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا۔ (گستاؤلی بان) سلیمان تو ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا، اس کے علاوہ بھی بہت سے عرب سیاح مشہور ہیں۔

مسعودی جس کی پیدائش چوتھی صدی ہجری میں ہوئی یہ ایک غیر معمولی ذہین عالم اور سیاح تھا۔ اس کا زمانہ سلیمان کے کچھ بعد کا ہے۔ اس نے اپنی عمر کے پچیس سال

ممالک اسلامی اور قرب و جوار کے ممالک مثلاً ہندوستان وغیرہ کے سفر میں صرف کیے۔ اس کی تحقیقات مختلف کتابوں میں شائع ہوئیں، خاص طور سے "مروج الذہب" جس کا ذکر پہلے بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ابن حوقل ہے، یہ بھی بغدادی ہے۔ اس نے اپنا سفر اس وقت شروع کیا جب مسعودی اپنا سفر ختم کر چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی تصنیف میں تمام ممالک اسلامیہ کا تفصیلاً نقشہ دیا جس میں ہر ملک کی سرحدیں، شہر، صوبے، دریا، سمندر وغیرہ دکھلائے۔ ملک کی پیداوار، مختلف قسم کے محاصل، بڑے بڑے راستے، ان کے فاصلے، اجناس تجارت وغیرہ، ان کل چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ البیرونی نے جو محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ چھٹی صدی ہجری ۱۰۰۱ھ میں ہندوستان آیا، سندھ و شمالی ہندوستان کے بارے میں بہت سے مشاہدات شائع کیے اور نجومی حسابات کے ذریعہ اس ملک کا نقشہ درست کرنے کا ارادہ کیا۔ ابوالحسن کا شمار بھی سیاحوں میں کیا گیا ہے جو تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس نے شمالی افریقہ کے ساحل ساحل مراکش تک کا سفر کیا، وہاں سے پھر مصر گیا۔ بطلیموس کے نقشہ افریقہ کو درست کرنے کی غرض سے چوالیس مقامات کے عرض البلد کو از روئے علم ہیئت دریافت کیا۔

(گستاؤلی بان)

عرب اور انیسویں صدی عیسوی تک دنیا کا سب سے بڑا عرب سیاح ابن بطوطہ ہے۔ اس نے ۱۳۲۵ء نویں صدی ہجری میں اپنا سفر شروع کیا۔ ابن بطوطہ تنجہ سے روانہ ہوا اور شمالی افریقہ، مصر، فلسطین، عراق عجم، شمالی عربستان میں مکہ تک اور پھر روس کے وسطی حصے سے گزر کر قسطنطنیہ وغیرہ سے ہوتا ہوا بخارا، خراسان، قندھار کے راستہ سے ہندوستان آیا اور یہاں کئی سال قیام کیا، پھر دہلی سے یہاں کے بادشاہ کا پیغام شہنشاہ چین کے نام لے کر بحری راستہ سے لنکا، سماترا اور جاوا سے ہوتا ہوا پیکن پہنچا جو چین کا عظیم شہر ہے اور پھر بحری راستہ سے وطن واپس آیا۔ اس کا یہ سفر پچیس سال میں ختم ہوا لیکن وہ پھر بھی نہیں تھکا اور اس نے ایک اور سفر اندلس کا کیا اور افریقہ کے اندرونی حصے ٹمبکٹو تک چلا گیا۔ ۱۳۷۷ء میں اس نے گویا ربع مسکون یعنی دنیا کے خشکی کے تمام علاقوں کا سفر کر کے فاس میں وفات پائی۔

یورپ کے ایک عظیم محقق موسیو لی بان کہتے ہیں کہ "ہمارے زمانہ میں بھی اتنا بڑا سفر موجب شہرت ہے۔" بلکہ آج ۱۹۷۸ء میں بھی اس کی وہی عظمت و اہمیت ہے اور یہ ایک عظیم ریکارڈ ہے۔

غرض! اس سیر و سیاحت، فتوحات و تجارت اور مذہبی ضروریات کی وجہ سے عربوں کی توجہ جغرافیہ کی طرف منعطف ہوئی چنانچہ سب سے پہلے عربوں نے اس علم میں جو تصنیف کی وہ اسلامی شہروں اور منازل کے حالات میں تھی کیونکہ مذہبی ضروریات سب سے مقدم ہیں۔ اس قسم کی تصنیف اہلِ ادب مثلاً اصمعی اور سکونی نے کیں۔ اس کے بعد پھر ہمدانی اور ابوالاشعث کندی نے پورے جزیرۃ العرب اور تہامہ کے پہاڑ وغیرہ کے حالات لکھے۔

جغرافیہ میں ترقیاں

جغرافیہ کی بنیاد اہلِ فینیشیا نے رکھی، پھر یونانیوں نے اس میں دسترس حاصل کی۔ جب عربوں نے جغرافیہ کا عربی میں ترجمہ کیا تو ان کی تمامتر تحقیقات کا دارومدار یونانی جغرافین بالخصوص بطلیموس کی تصنیفات پر تھا لیکن وہ اپنی فطری ذہانت اور عادت کے بموجب بہت جلد اس میدان میں اپنے استادوں سے بھی آگے بڑھ گئے اور اپنی معلومات اور تحقیقات سے اس میں نہایت قیمتی اور قابل قدر اضافہ کیا۔ چونکہ ان کا مزاج ہی محققانہ تھا، اس لیے انہوں نے صرف روایات اور بیانات پر ہی بس نہیں کیا بلکہ خود بری و بحری سفر کیے اور بچشم خود دنیا کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کر کے ان کتابوں کو مدون کیا۔ بطلیموس کے زمانہ کے جغرافیہ کی بہت سی غلطیوں کو درست کر دیا۔ بطلیموس نے شہروں کے محل وقوع کی دریافت میں بڑی غلطیاں کی تھیں مثلاً بحر متوسط ہی کے طول میں اس نے چار سو فرسخ کی غلطی کی تھی۔

عربوں نے جو کچھ جغرافیہ میں ترقی کی اس کے ثبوت کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ ان کے تحقیق کیے ہوئے مقامات اور امکنہ کا مقابلہ یونانیوں کے ساتھ کیا جائے تو اس مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ عربوں کے تحقیق کردہ عرض البلد میں صرف کچھ دقیقوں کا فرق

ہے۔ اس کے برعکس یونانیوں نے درجوں کی غلطی کی ہے۔ طول البلد کی تحقیق میں البتہ انہوں نے کچھ زیادہ غلطیاں کی ہیں لیکن وہ بھی یونانیوں کے مقابلہ میں بدرجہا کم ہیں۔ مثلاً تنجہ کے طول البلد کو اسکندریہ سے حساب لگا کر بطلیموس نے ۳۵ درجہ اور تیس دقیقہ لکھا ہے حالانکہ واقعی طول البلد ۲۵ درجہ ۴۱ دقیقہ ہے یعنی بطلیموس کی تحقیق میں ۱۸ درجہ کی غلطی ہے۔ عربوں کے نقشہ میں بحر متوسط کے طول میں تنجہ سے طرابلس تک کل ایک درجہ کی غلطی ہے حالانکہ بطلیموس کے نقشہ میں اس کو ۱۹ درجہ زیادہ لمبا قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے چار سو فرسخ کی غلطی واقع ہوئی۔

(تمدن اسلام' موسیو گستاؤلی بان)

مسلمانوں نے علم جغرافیہ کی تکمیل چوتھی صدی ہجری مطابق نویں صدی عیسوی میں کی۔ اس زمانہ میں انہوں نے اس فن میں بھی ایسی تصنیفات شروع کیں جیسی کہ تاریخ میں۔ انہوں نے جغرافیہ میں بھی بڑی بڑی تصنیفات چھوڑی ہیں جن میں سے بعض بعض مدت دراز تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہیں۔ (موسیو لی بان)

سب سے پہلے مسلمانوں میں اس فن میں ابو زید بلخی نے تصنیف کی۔ چوتھی صدی ہجری میں اس نے اس فن میں ایک کتاب "صور الاقالیم" یونانیوں کے طرز پر لکھی۔ اس کے ہمعصر ابو اسحٰق فارسی نے' جو کہ بہت بڑا سیاح تھا' خود سفر کر کے تحقیق کے ساتھ کتاب "مسالک الممالک" لکھی۔ ابن حوقل نے بھی اس فن میں ایک کتاب مدون کی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کی تصنیف بھی ذاتی اسفار و سیاحت پر مبنی ہے۔ اس نے اپنا سفرنامہ ۳۳۱ھ میں مدینہ طیبہ سے شروع کیا۔ اس سے قبل مسعودی اپنے سفر کے حالات قلمبند کر چکا تھا' نیز المقدسی بھی اپنا سفرنامہ مرتب کر چکا تھا۔ اصطخری کا جغرافیہ چوتھی صدی ہجری میں شائع ہوا۔ سب سے مشہور جغرافی ادریسی ہے۔ اس کی تصنیفات کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر جغرافیہ کا علم یورپ کے ازمنہ وسطیٰ میں پھیلا دیا۔ (لی بان)

ادریسی اندلس میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنا جغرافیہ ۱۱۵۴ء میں لکھا۔ اس کتاب میں نہ صرف یہ کہ متقدمین کی تمام تصنیفات درج ہیں بلکہ خود اس نے سیاحوں کی زبانی بہت

سے حالات سن کر لکھے ہیں۔ اس جغرافیہ میں متعدد نقشے ہیں اور تین صدی سے بھی زیادہ تک اہلِ یورپ نے محض اس کتاب کی تقلید پر قناعت کی۔ اس کے نقشہ میں دریائے نیل کا منبع دو بڑی خط استواء والی جھیلیں ہیں جن کو اہلِ یورپ نے بہت قریب زمانہ میں معلوم کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کی واقفیت جغرافیہ میں اس سے بہت زیادہ تھی جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا رہا ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد جب علم تاریخ کی طرف عربوں نے توجہ کی تو جغرافیہ کی ترتیب بھی باقاعدہ شروع کی اور شہروں اور مقامات کے نام حروف تہجی پر لکھے۔ اس قسم کی سب سے مشہور تصنیف یاقوت حموی کی ہے جس نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی۔ اس نے "معجم البلدان" لکھی جس میں اس نے شہروں، گاؤں، وادیوں، سمندروں، نہروں، جنگلات اور بنوں وغیرہ کے مفصل حالات لکھے۔ یہ کتاب جغرافیہ کی قاموس خیال کی جاتی ہے۔

ابوالفداء نے بھی ایک کتاب "تقویم البلدان" کے نام سے لکھی، اس کا زمانہ ۱۲۷۱ء سے ۱۳۳۱ء تک ہے مگر اس نے دوسری کتابوں سے اخذ کیا ہے۔ یہی حالت مقریزی اور ابوالحسن کی بھی ہے۔ جغرافین عرب اور ان کی تصنیفات کی کافی لمبی چوڑی فہرست ہے۔ فقط ابوالفداء نے ساٹھ جغرافین کے نام لکھے ہیں جو اس سے پہلے کے ہیں اور اس کے بعد تو بہت ہی بڑی تعداد گزری ہے۔ بعض مصنفوں مثلاً موسیو وی۔ این۔ ڈی اور سینٹ مارٹن وغیرہ نے عربوں کی جغرافی تحقیقات سے قطع نظر کیا ہے۔ موسیو لی بان کی زبان میں اس کی وجہ بجز تعصب کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ صحیح علمی تحقیقات کے لحاظ سے عربوں نے ہیئت کے وہ درست حسابات کیے جن پر نقشوں کی بنیاد ہے اور انہوں نے یونانیوں کی فحش غلطیوں کی تصحیح کی۔ سیاحت اور اسفار کے لحاظ سے انہوں نے ایسے سفرنامے شائع کیے جن سے دنیا کے ان ممالک کے حالات جو پہلے معلوم نہ تھے اور جہاں اہلِ یورپ کا گزر بھی نہ ہوا تھا ظاہر ہوئے جیسے سفرنامہ چین سلیمان وغیرہ کا۔ علم جغرافیہ میں بھی یورپ نے کئی صدیوں سے مسلمانوں کی تصنیفات کی تقلید کی۔

اسلام کے بعد خطابت

اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ شعر اور خطابت فنون جاہلیت میں سے ہیں لیکن اسلام نے شعر کے مقابلہ میں خطابت کی خاص طور سے ہمت افزائی کی اور اسے عروج و ترقی کی آخری منازل تک پہنچا دیا جبکہ غیر شرعی اور آزاد شاعری کی مذمت کی۔ کیونکہ خطابت اسلام کے تبلیغی، حکومتی، جنگی اور تمدنی امور کے لیے ایک ضروری چیز تھی اور اہلِ عرب جیسا کہ پہلے بتایا گیا فصیح و بلیغ کلام سے بے حد متاثر ہوتے تھے خواہ وہ خطبہ ہو یا شعر یا کوئی ضرب المثل لیکن اسلام سے پہلے ان کے نزدیک شاعر کی عزت و وقعت بہ نسبت ایک خطیب کے بہت زیادہ تھی۔ مابعد اسلام یہ ترتیب الٹ گئی۔ اسلام نے شاعر کی اہمیت ختم کر کے خطیب کو اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ (البیان ص ۹۸ ج ۱) کیونکہ جنگی امور میں دشمنوں کو خوف زدہ کرنے اور فوجیوں کو جمع کرنے، ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے میں اس کی سخت ضرورت تھی۔ نیز تبلیغ دین، دینی معاملات میں ترغیب اور ترہیب، بیان احکام اور مواعظ میں اس کی سخت ضرورت تھی۔ جاہلیت اور اسلام کی خطابت میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اسلام نے اس میں حکمت، موعظت اور نصیحت کی باتیں نیز قرآن پاک کی فصیح و بلیغ آیات کا اضافہ کیا جس کی وجہ سے اس کی تاثیر ہزار درجہ بڑھ گئی۔ ان کے خطبے نہایت بااثر اور پُرجوش ہوتے تھے جن کی مثال دیگر ملل و اقوام میں معدوم ہے۔ (جرجی زیدان)

اہلِ روما اور اہلِ یونان میں بھی بڑے بڑے خطیب اور لیکچرر اور اسپیکر اور خطیب ہوئے ہیں۔ مثلاً ڈیموستینس، اشینس اور ھپریدس یونان میں اور شیشرون، بولیوس قیصر، سالوسٹس اور لوکیوتس روما میں مگر اسلامی خطباء و اسپیکروں نے ان کی خطابت کو پس پشت ڈال دیا اور وہ ان کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ اسلام کے خطباء اور ان کے خطبوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ خلفاء، امراء اور فوجی افسران، نیز علماء و واعظین کے لیے تو خطیب ہونا ضروری تھا۔ (البیان ص ۱۳۵ ج ۱)

مورخین کا بیان ہے کہ یونانی خطیب و مقرر ڈیموستینس جو ان کا سب سے بڑا مقرر

خیال کیا جاتا ہے‘ اس کے تمام خطبوں کی تعداد کل ۱۶۱ ہے جن میں سے آدھے بھی بمشکل اس کے ہوں گے۔ اس کے بالمقابل خلیفہ رابع صرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خطبات کا اگر شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ عام مسلمان بھی اس میں مہارت پیدا کر لیتے تھے اور اس وجہ سے ان کو اسلام پھیلانے میں بڑی مدد ملی۔ فوجی افسران بھی حسب موقع اس سے بڑے کام لیتے تھے اور یہ واقعات اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کا احصاء و احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

خلفاء راشدین کے بعد خطابت میں جو کمال بنی امیہ کے حکمران اور ان کے فوجی و غیر فوجی افسروں کو حاصل تھا اس کا عشر عشیر بھی ہمیں بنی عباس کے زمانہ میں نظر نہیں آتا۔ آنحضرت ﷺ (وارواحنافداہ) کے وصال کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے، حجاج بن یوسف نے کوفہ میں‘ عبدالملک بن مروان‘ عبداللہ بن زبیر‘ ولید بن عبدالملک نے دمشق میں اور دیگر خلفاء بنی امیہ نے جو خطبات دیئے ہیں وہ آج بھی عدیم المثال اور فن خطابت کا زریں باب ہیں۔ ان خطبوں میں جو فصاحت و بلاغت‘ محاسن کلام اور قوت تاثیر ملتی ہے وہ بعد کے زمانہ میں نظر نہیں آتی۔ قبائل میں بھی خطابت کا رواج تھا‘ ان کے خطبے آج بھی استناد و اقتباس کے لائق ہیں اور انشاء پردازانِ عرب نے ہمیشہ ان سے اسلوب کلام اور فصاحت و بلاغت کو اخذ کیا ہے۔

اسلام کے بعد شاعری

نزول قرآن کے بعد قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت‘ محاسن اور قوت اثر نے ان کے قلوب کو اس قدر مسخر کر لیا تھا کہ وہ شعر گوئی سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ صرف حسان بن ثابت کاتب وحی اور کعب بن زہیر وغیرہ جیسے بزرگ صرف بوقتِ ضرورت شعر کہتے تھے اور وہ بھی دشمنوں کے مقابلہ میں‘ ان کے اشعار کا جواب اشعار کے ذریعہ سے دینے کے لیے لیکن ان کے اشعار میں جاہلیت کی سی فحاشی‘ لغو بیانی‘ دروغ گوئی اور غیر حقیقی مبالغہ آرائی‘ توہم پرستی‘ تکبر و غرور‘ بے ہودگی اور سوقیت نہ تھی۔ بلکہ متانت‘ سنجیدگی‘ صداقت اور حقیقت نگاری پائی جاتی تھی۔ کعب بن زہیر کا مشہور قصیدہ ”بانت

سعاد" ہمارے اس دعوے کی صداقت کی بین و روشن دلیل ہے لیکن اس کے باوجود شعر گوئی کا عام رجحان ختم ہو چکا تھا اور لوگ قرآن پاک کو اپنے لیے کافی خیال کرتے تھے اور صحیح بات یہی ہے کہ ان کے ادبی جذبات کی تسکین کے لیے قرآن کریم سے بہتر ان کے پاس اور کوئی کلام بھی نہ تھا۔ "سبع معلقات" جو عربی شعر و ادب کی معراج خیال کیے جاتے تھے قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی آیت کے مقابلہ میں بے نُور دکھائی دینے لگے۔

اس وقت کے ایک مشہور مسلمان شاعر سے سوال کیا گیا کہ "تم اب شعر کیوں نہیں کہتے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "جس کے پاس سورۂ بقرہ ہو اسے شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

چونکہ قبل اسلام زمانہ جاہلیت کے اشعار میں دروغ گوئی، لغو بیانی اور دیگر پست اخلاقی مظاہرہ ہوتا تھا اور یہ عیوب ان کی طبائع میں راسخ ہو چکے تھے، اس لیے قرآن کریم نے ایسے شعراء کی سخت ترین انداز میں مذمت فرمائی تاکہ لوگ اونچ ترین مقصد کے حصول میں بد ترین اخلاقی پستی اور انسانی گراوٹ کا شکار نہ ہوں، اس لیے بھی اہلِ اسلام نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کی۔ صرف وہی لوگ شعر کہتے تھے جو صداقت کا التزام کرتے اور ان تمام عیوب و نقائص سے دور تھے لیکن قرنِ اوّل میں شعر گوئی سے ان کی کنارہ کشی بعد کے زمانہ میں جاری و قائم نہ رہ سکی۔

بنی امیہ کے دور حکومت میں اس میں پھر جان پڑنے لگی اور لوگ رفتہ رفتہ شعر گوئی کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ بنی امیہ نے بھی ان کی ہمت افزائی کی اور اس کے متعدد اسباب و وجوہات تھے۔ چونکہ قرآنی الفاظ کی تشریح اور محاورات اور الفاظ کے صحیح استعمال کی سند کے لیے بھی ادب قدیم کی ضرورت تھی اس لیے شعر کے تحفظ کی طرف توجہ کی گئی۔ اسی وجہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "شعر کو تم اپنا بڑا مقصد اور بڑا ادب سمجھو۔" بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک پولٹیکل مصلحت پوشیدہ تھی مگر ہمیں اس فاسد خیال کے یقین کر لینے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جملہ کا مطلب واضح ہے۔ ان کا اشارہ ادب لطیف کی طرف ہے کہ شعر پاکیزہ مقصد اور پاکیزہ ادب کے

لیے ہونا چاہیے اور اسے ہر قسم کی فحاشی، لغو بیانی جیسے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ستھرا ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ شعراء کے مذمیہ مقاصد سے خائف تھے تو وہ بزور حکومت شعر گوئی کا انسداد کر سکتے تھے اور خطباء سے اپنی ہمنوائی کا کام لے سکتے تھے جیسا کہ انہوں نے کیا بھی، اس لیے ہم اس عیسائی مورخ کے ان الفاظ کو خود اس کی ایک تاریخی وسیاسی مصلحت خیال کرتے ہیں۔

بہرحال اگرچہ شعر کی طرف توجہ مندرجہ بالا وجوہات کی وجہ سے کی گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ پھر شعر گوئی کا رجحان ترقی کرنے لگا۔ ابتداء میں شعراء نے صداقت و حقیقت اور راست گوئی کا خاص خیال رکھا لیکن یہ پابندی قائم نہ رہ سکی۔ شعراء پہلے حدود مبالغہ آرائی میں داخل ہوئے، پھر صریح دروغ گوئی اور آزاد خیالی میں خاص طور سے متنبی کے زمانہ میں تو یہ بالکل ہی ختم ہو گئی۔

بنی امیہ کے دور حکومت میں عبدالملک بن مروان کا زمانہ شاعری کے لیے خاص طور سے شہرت و امتیاز رکھتا ہے۔ یہ خود بھی شاعر تھا اور شعر کا قدر دان بھی۔ اس کے زمانہ میں شعر و شاعری کا ایسا چرچہ تھا کہ جہاں چند لوگ جمع ہوئے مجلس شعر گرم ہو جاتی تھی۔ اس کے زمانے میں علم و ادب کی طرف لوگوں کو رغبت بہت زیادہ ہو گئی تھی کیونکہ عربوں کا مذاق ادبی تھا اور بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ فرزدق اس زمانہ کا مشہور اور بڑا شاعر گزرا ہے لیکن حضرت عمر و بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کے رجحان طبع کو دیکھا کہ وہ پھر ایک غلط راستے کی طرف جانے والا ہے تو انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں شعراء کی قدر و منزلت کو کافی حد تک گرا دیا لیکن ان کی خلافت کا زمانہ بہت ہی مختصر سا ہے جس میں یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان کی وفات کے بعد لوگ پھر اپنی سابقہ حالت پر آ گئے۔ بنی عباس کے زمانہ میں خلیفہ منصور نے انہیں منہ نہیں لگایا لیکن مہدی، رشید اور مامون نے ان کی کافی قدردانی کی۔ ان کے یہاں شعراء کی اکثریت رہتی تھی۔ ان میں سے بشار بن برد، ابونواس، ابوالعتاہیہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اس کے بعد ترکوں کے دور اقتدار حکومت میں شعراء کی کچھ پرسش نہ ہوئی تاآنکہ دولت بنی حمدان قائم ہوئی۔ یہ چونکہ عربی حکومت تھی اس لیے

شعراء کو پھر ابھرنے کا موقع ملا اور سیف الدولہ وزیر کا مکان شعراء کا دارالاقامہ (ہاسٹل) بن گیا۔ وہ خود بہت بڑا ادیب تھا اور شاعر بھی۔ اس کے زمانہ کے شعراء میں سے ابو فراس، متنبی، نامی وغیرہ مشہور ہیں۔

اشعار کی تدوین

یہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ بنی امیہ کے زمانہ میں ہی ادب جاہلیت کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ ہو چکی تھی۔ اس کی وجوہات بھی ہم بیان کر آئے ہیں۔ اشعار کی تدوین کی ابتداء پہلی صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کام میں جو لوگ سب سے زیادہ مشغول ہوئے وہ اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ ہیں جیسا کہ ہم تاریخ ادب و انشاء بیان کرتے ہوئے بتلا چکے ہیں۔ کوفہ والوں نے بہ نسبت اہلِ بصرہ کے زیادہ اشعار جمع کیے۔ (المزہر ص ۱۴۹ ج ۲) سب سے پہلا شخص جس کو اشعار جمع کرنے کی طرف توجہ ہوئی وہ حماد دیلمی تھا جس کی وفات ۱۵۵ھ میں ہوئی۔ (ابن خلکان ص ۱۹۴ ج ۱) اس کے بعد فرغانی ہوا۔ (طبقات الادباء ص ۶۹) پھر ابو عمرو، ابو عبیدہ اور اصمعی وغیرہ ہوئے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں جس قدر اشعار جمع کیے گئے ان کی تعداد دس ہزار قصیدوں سے زائد ہے جس کی مثال دنیا کی کسی بڑی سے بڑی متمدن قوم میں بھی نہیں ملتی۔ اگرچہ بعض راویوں نے خود اپنے اشعار بھی عربوں کے اشعار میں داخل کر دیئے تاہم ایسے اشعار کی تعداد برائے نام ہے۔ (ابن خلکان ص ۲۰۸ ج ۱) اسی وجہ سے عربوں نے شعر کی روایت میں بھی سند کے صحیح ہونے کا پورا پورا خیال رکھا جیسا کہ وہ حدیث کی سند کا خیال رکھتے تھے۔

زمانہ اسلام میں لوگ متعدد اغراض کے لیے اشعار حفظ کیا کرتے تھے۔ نحوی حضرات اس لیے شعر حفظ کرتے کہ وہ زبان کے قوانین میں ان کو بطور مثال پیش کر سکیں۔ اہلِ ادب ضرب الامثال اور اقوام عرب کی حفاظت کے لیے، اہلِ لغت مشکل الفاظ کی تحقیق، معانی و تشریح کے لیے، مفسر اور محدث قرآن و حدیث کے معانی کی محاورۂ عرب اور ان کے استعمال کے مطابق تشریح کرنے کے لیے، لیکن بعض لوگ

ایسے بھی تھے جو ہر قسم کے اشعار حفظ کر لیتے تھے۔ انہیں میں سے حماد، خلف، ابو عمرو اور ابو عبیدہ ہیں۔

طبقات الشعراء

کسی ملک کے تمام افراد کا معیارِ زندگی و طرزِ معیشت مساوی نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دولت و امارت کی وجہ سے انواع و اقسام کا سامانِ تعیش استعمال کرتے ہیں اور بعض افراد کو بوریائی بستر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کچھ افراد قصور و محلات میں ناز و نعمت میں پروان چڑھتے ہیں اور کچھ افراد کو سر چھپانے کے لیے نیلگوں آسمان کے شامیانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بعض افراد دیہی زندگی گزارتے ہیں اور بعض شہرو قصبات کی متمدن زندگی۔ یہی کچھ حال اہلِ عرب کا بھی تھا۔ ان کی زندگی بھی بدوی و شہری اور امارت و ثروت اور غربت میں منقسم تھی۔ بدوی کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک بے نہایت لق و دق صحرا میں چلا جاتا ہے۔ اس کے گرد بجز ریگستانوں اور ٹیلوں کے کچھ نہیں ہوتا۔ رات کے گھٹاٹوپ اندھیروں اور دن میں سورج کی آگ اگلتی ہوئی کرنوں سے پناہ لے کر وہ اپنے صوف و وبریا چمڑے کے بنے ہوئے خیمے میں پڑا رہتا ہے۔

اس کی کل دنیا وہی اونٹ ہے، انہیں کا دودھ پی کر وہ زندہ رہتا ہے اور انہیں کے ذریعہ وہ اپنا سفر طے کرتا ہے اور انہیں کو بیچ کر وہ اپنی زندگی کی دیگر ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کی ہمخواب تلوار ہے اور اس کا تکیہ اونٹ کا کجاوہ۔ اسے جنگل کے موذی جانور اور اپنے دشمن کے علاوہ کسی کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اپنے احباب و قبیلہ کی محفل گرم کرنے کے لیے وہ ریتیلے میدان ہی کو فرش مخمل اور قالین تصور کرتا ہے۔ اس کے تمام شاعرانہ تخیلات و احساسات انہی چیزوں تک محدود رہتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے بہتر اور دلچسپ زندگی کسی کی نہیں۔ اس کے برعکس ایک طبقہ وہ ہے جو امراء کے قصور و محلات میں پیدا ہوا، عیش و عشرت میں پرورش پائی، ناز و نعمت میں پروان چڑھا، دیبا و حریر اس کا لباس رہا، رہنے کے لیے خوبصورت عمارتیں، حسین و جمیل ساز و سامان سے آراستہ کمرے، چہل قدمی و سیر کے لیے صحن باغ، صحن چمن، وقت گزاری کے لیے سریلے اور

مدہوش کر دینے والے نغمے اور رقص و سرود کی محفلیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے جذبات و خیالات میں بھی یقیناً اتنا ہی فرق ہو گا جتنا فرق ان کی معاشرتی زندگی میں ہو گا۔

شاعری جذبات و خیالات پر موقوف ہے اور جذبات زندگی اور ماحول سے پیدا ہوتے ہیں۔ دو طبقوں کے درمیان اگر ان کی زندگی اور ماحول میں فرق ہو گا تو یقیناً جذبات و خیال میں بھی تفاوت ہو گا اور یہ اختلاف جس درجہ کا بھی ہو گا خیالات کے اختلاف و تفاوت کا درجہ بھی وہی ہو گا۔ مدارج زندگی کا یہ فرق ہمیں اہلِ عرب کی قبل از اسلام اور بعد از اسلام کی زندگیوں میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ قبل از اسلام عربوں کی زندگی نہایت سادہ، بے تکلف اور غیر مصنوعی ہے لیکن ظہور اسلام کے بعد ایک صدی کے اندر اندر اس میں تکلف، نزاکت اور قدرے تلون آگیا ہے، اسی لیے ان کے تخیلات میں بھی فرق نظر آتا ہے اور چونکہ شاعری کی بنیاد تخیلات ہے اس لیے ان کے اشعار میں بھی نمایاں تفاوت ہے۔

زمانہ جاہلیت کے اشعار میں ہمیں متانت، سنجیدگی، سادگی اور بدویت نظر آتی ہے جو ان کی اسی زندگی کی آئینہ دار ہے اور اس کے بعد کی شاعری میں کنایہ، استعارہ، نزاکت، لطافت خیال اور ایک قسم کی رنگینی کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے جو ایک متمدن و پُر تکلف زندگی کا خاصہ ہے۔ پھر قرآن کریم کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی وجہ سے ان کے اشعار اور بھی بلند ہو گئے ہیں، چنانچہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، عمرو بن ربیعہ، جریر، فرزدق، ذی الرمہ، احوص اور حطیہ بلاغت کلام اور تفنن طبع میں نابغہ، عنزہ، ابن کلثوم، زہیر، علقمہ اور طرفہ سے بدرجہا بلند ہیں۔ (ابن خلکان ص ۸۵ ج ۱) جس طرح کہ خطباء اسلام خطباء جاہلیت سے فصاحت بیان و بلاغت کلام میں اعلیٰ ترین درجہ رکھتے ہیں۔

شعراء عرب چار طبقوں میں منقسم ہیں: (۱) طبقہ اولیٰ شعراء جاہلیت کا ہے۔ (۲) دوسرا طبقہ ان مسلمان شعراء کا ہے جو آخر حکومت بنی امیہ تک ہوئے۔ یہ مخضرمین کہلاتے ہیں۔ (۳) پھر تیسرا طبقہ شعراء دولت بنی عباس کا ہے اور یہ مولدین کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد محدثین کا طبقہ ہے۔ شعراء کی یہ تقسیم قطعاً اجمالاً ہے۔ جاہلیت

کے شعراء جو مشاہیر میں سے ہیں امراء القیس، نابغہ، عنزہ، ابن کلثوم، علقمہ اور طرفہ وغیرہ ہیں۔ یہ اصحاب معلقات کہلاتے ہیں۔ دوسرا طبقہ مخضرمین کا ہے جس میں حسان بن ثابت، جریر، اخطل، فرزدق، کعب بن زہیر، احوص، حطیہ اور عمرو بن ربیعہ ہیں۔ یہ متانت و سادگی میں طبقہ اولیٰ سے مشابہت رکھتے ہیں مگر فصاحت و بلاغت میں ان سے بہت بلند ہیں۔

تیسرا طبقہ مولدین کا ہے۔ اس میں وہ شعراء ہیں جو ہارون الرشید اور مامون الرشید خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں تھے جن کا زمانہ اپنے تمدن کے لحاظ سے مورخین کی نگاہوں میں اہلِ اسلام کا زریں دور کہلاتا ہے۔ تمدن کی بلندی اور معاشرت کی ترقی کی وجہ سے ان کے خیالات میں نزاکت، لطافت اور محبّت پائی جاتی ہے۔ ان کے مزاج میں رنگینیت اور جدت نظر آتی ہے۔ ان کے مشہور شعراء میں بشار بن برد، ابوالعتاہیہ، ابونواس، ابوتمام اور بحتری وغیرہ ہیں۔ چوتھا طبقہ ان شعراء کا ہے جو علوم یونانی اور فلسفہ کی ترویج کے بعد ہوئے۔ اس طبقہ کے اشعار میں فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے جیسے متنبی، صفی اور ابوالعلا معری وغیرہ۔ (جرجی زیدان) ان میں سے آخر الذکر کے کلام کی تقریباً وہی خصوصیات ہیں جو اردو شعراء میں مرزا غالب کی۔

شعراءِ اسلام اور ان کے اشعار

گزشتہ اوراق میں آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ اشعار جاہلیت کے دس ہزار قصیدے ہیں لیکن زمانہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ شعراء اور اشعار ہوئے ہیں۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ہارون بغدادی نے ایک کتاب شعراء مولدین کے بارے میں لکھی تھی جس کی ابتداء بشار سے کی تھی اور محمد بن عبدالملک پر ختم کر دیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان شعراء کی تعداد ایک سو اکسٹھ تک پہنچ گئی۔ ان سب کے حالات اس نے تحریر کیے حالانکہ ان دونوں کے درمیان تھوڑے ہی زمانہ کا فاصلہ ہے۔ اس سے دوسرے طبقات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان شعراء کے قصائد و دیوان بھی لاتعداد ہیں۔ صاحب کشف الظنون نے چھ سو دیوان چھ سو مشہور شعراء کے لکھے ہیں۔ ان کے نام القاب اور

سالہائے وفات بھی بیان کیے ہیں۔ لطف یہ کہ یہ سب عراق، شام، فارس، خراسان، مصر اور اندلس کے شعراء ہیں، خاص اہلِ عرب نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض بعض دیوان دو دو ہزار صفحات تک کے ہیں اور ہر صفحہ بیس سطر کا ہوتا تھا۔ بشار کا دیوان ہزار ورق کا ہے تو اس حساب سے اس کے چالیس ہزار اشعار ہوئے۔ اسی قدر تعداد ابونواس کے اشعار کی بھی ہے، اسی پر اوروں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (الفہرست ص ۱۵۹) ان کے علاوہ جب ان دواوین کا خیال کیا جائے جو ضائع ہو گئے یا صاحب کشف الظنون نے ان کا تذکرہ نہیں کیا تو انسان عربی اشعار کی تعداد کے تصور ہی سے حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ دنیا کی کسی قدیم و جدید قوم میں اس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ (جرجی زیدان)

شعراء کی قدردانی

عوام کو شعر و شاعری سے کتنی دلچسپی اور تعلق تھا؟ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں چار افراد جمع ہوں اور وہاں شعر کا ذکر نہ آئے لیکن حکمران طبقہ بھی اس سے متاثر تھا۔ اکثر خلفاء خود بھی شعر کہتے تھے اور شعراء کے قدردان بھی تھے۔ خلفاء کے پاس جب شعراء جاتے تو وہ خواہ کسی بھی شغل و مصروفیت میں ہوں، ان کو ضروری باریابی کی اجازت مل جاتی تھی۔ شعراء ان کو اپنا قصیدہ سناتے اور خلفاء ان کی داد و تحسین کرتے۔ (ابن خلکان ص ۷۰ ج ۲) جب وہ اپنا قصیدہ ختم کر لیتا تو اس کو انعام دیا جاتا تھا جس کی تعداد ایک لاکھ اور کبھی کبھی دس لاکھ درہم تک ہوتی تھی۔ (ابن خلکان ص ۱۲۸ ج ۲)

بعض بعض شعراء کے ماہانہ وظائف و تنخواہیں مقرر کر دی جاتیں۔ تمام خلفاء میں شعراء کے لیے سب سے زیادہ فیاض بغداد میں رشید و مامون اور مہدی اور اندلس میں ناصر و منصور، امراء میں خالد قسری امیر عراق اور سیف الدولہ بن حمدان تھے۔ خلفاء اور امراء عام طور سے شعراء کو انعام دینا ضروری خیال کرتے تھے اور یہ ان کی عزت افزائی کا ایک طریقہ تھا۔ کبھی مشاعرے بھی ہو جاتے تھے۔ المعتضد عباد جس کی وفات ۴۶۱ھ میں ہوئی، نے خاص مجلس شعراء کے لیے ایک بہت بڑا مکان تعمیر کرایا۔ ہر دو شنبہ کو اس

میں شعراء کی محفل گرم ہوتی اور اہلِ ادب اپنے اپنے ذوق کی تسکین کرتے۔ اس دن وہاں کسی اور معاملہ کے لیے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ (نفح الطیب ص۱۱۹ ج ۲)

تمام خلفاء میں سب سے بہتر شاعر یزید بن معاویہ تھا۔ اس کے اشعار کے تین مجموعے تھے۔ (ابن خلکان ص۵۰۸ ج ۱)

ولید ابن یزید ابن عبدالملک اور ہارون بھی شعر کہتے تھے اور بلا استثناء سب سے بڑھ کر شاعر عبداللہ بن معتزلی تھا جس کی وفات ۲۹۶ھ میں ہوئی۔ وہ صرف چوبیں گھنٹہ خلیفہ رہا۔ یہ صاحب دیوان اور بے حد علم دوست انسان تھا۔ (ابن خلکان ص۲۵۸ ج ۱)

خلفاء بنی عباس کا آخری فرد راضی باللہ بھی شعر گو تھا جس کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی۔ (الفخری ص ۲۵۲)

شعراء کی قدر دانی وہی خلفاء و امراء کرتے تھے جو خود بھی شاعر تھے۔ ولید بن یزید نے یزید بن منبہ کو ایک مدحیہ قصیدہ کے ہر شعر کے عوض ایک ہزار درہم انعام دیا۔

(ابن الاثیر ص ۱۳۷ ج ۵)

اسی طرح دیگر امراء و خلفاء کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ خود بھی شاعر تھے، اسی لیے ان کے زمانہ میں شاعری کو بہت عروج ہوا۔ چنانچہ سیف الدولہ، جس نے شعراء کی بے حد قدر دانی کی، خود بھی شاعر تھا۔ (ابن خلکان ص۳۶۵ ج ۱)

ان کے علاوہ دیگر خلفاء و امراء بھی گو خود شاعر نہ تھے مگر شعراء کے قدر دان ضرور تھے۔ کچھ تو اس لیے کہ وہ علم و ادب کی خدمت کا خیال رکھتے تھے اور کچھ اس لیے کہ وہ شعر کی فطری تاثیر کی وجہ سے شعراء کی مذمت سے خائف رہتے تھے۔ اس زمانہ میں شعراء کو وہی حیثیت حاصل تھی جو ہمارے زمانہ میں اخبار نویس اور صحافیوں کو حاصل ہے۔ وہ بے دھڑک اور بے خوف و خطر خلیفہ ہو یا امیر، وزیر ہو یا سپہ سالار، اس کی خامیوں اور غلطیوں کو نمایاں کر دیا کرتے تھے۔ حکومت کے طریقے، نظم و نسق، کسی امیر یا وزیر کی قابلیت و استعداد اور صلاحیتوں میں اگر نقص ہوتا تو وہ نہایت بے باکانہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ (تمدن عرب از جوزف ہیل جرمنی مستشرق)

علومِ دخیلہ

جو علوم عربوں میں دیگر بلاد و امصار اور ممالک سے در آمد ہوئے ان میں فلسفہ و منطق کو اولیت حاصل ہے، چنانچہ سب سے پہلے ہم تاریخ فلسفہ و منطق کے متعلق بیان کریں گے۔

تاریخ فلسفہ و منطق

فلسفہ ایک یونانی علم ہے۔ اس کی ابتداء یونانیوں میں ہوئی جو کہ ایک نہایت قدیم قوم ہیں اور جن کی تاریخ تمدن بھی بہت زیادہ پرانی ہے بلکہ ان کے آداب تاریخی کی ابتداء زمانہ تاریخ سے پہلے کی ہے۔ ابتداءً ان کا ذوق بھی شاعرانہ تھا۔ نثر کا ان کے یہاں رواج نہ تھا اور نہ اس کی طرف ان کو کچھ رغبت تھی۔ چنانچہ ان کے دیوتاؤں کے حالات اور بڑی بڑی لڑائیوں کے واقعات سب نظم میں ملتے ہیں۔ ان منظومات میں سب سے زیادہ قدیم الیڈ اور اوڈیس ہیں جن کو ہیومر نے نویں صدی قبل مسیح میں لکھا تھا۔ (موسیو لی بان) رفتہ رفتہ پھر وہ نثر کی طرف بھی مائل ہوئے اور اس قسم کی سب سے پہلی کوشش پانچویں صدی قبل مسیح میں کی گئی جبکہ بردوط (ہیروڈوٹس) مشہور یونانی سیاح متوفی ۴۰۶ھ قبل مسیح نے اپنا سفرنامہ نثر میں مرتب کیا۔ اس نے اس کتاب کو ۴۳۱ قبل مسیح میں لکھا۔ اس میں اس نے اس لڑائی کے وجوہ و اسباب بیان کیے ہیں جو اہلِ یونان اور اہلِ فارس کے درمیان آخری چھٹی صدی قبل مسیح اور ابتدائی پانچویں صدی قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "ام التاریخ" ہے۔

اس کے بعد پھر نثر نویسی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور خطابت کی طرف بھی توجہ ہونے لگتی ہے اور قوانین و ضوابط کی طرف بھی اور سیاست کی طرف بھی میلان نظر آتا ہے۔ یہی زمانہ فلسفہ کی ابتدا کا بھی زمانہ ہے کیونکہ اس زمانہ میں ان کے شاعرانہ تخیلات عروج پر پہنچ گئے تھے جہاں پہنچ کر انسانی دماغ کسی شے کی علل و اسباب کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ اس کی ترقی مورہ والوں کی لڑائی کے بعد ہوئی جو کہ ایتھنز کے باشندوں کے ساتھ

۴۳۱ ق م میں لڑی گئی اور جس کے نتیجہ میں ایتھنز اہلِ قدیمونیا کے ہاتھ اور قبضہ میں آ گیا' اس لیے باشندگانِ ایتھنز حکومت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس علم کا بانی و موجد سقراط کو بتلایا جاتا ہے لیکن اس سے بھی پہلے جب اہلِ یونان اور اہلِ فارس کے مابین جنگ ہوئی تو انہوں نے طبیعیات پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ اس میں کوئی خاص ترقی نہ کر سکے تھے اور اس میدان میں ان کی پیش رفت محدود ہی رہی۔

سب سے پہلا شخص جو یونان میں فلسفہ طبیعی سے واقف تھا اس کا نام طالیس ہے۔ یہ ملیطہ میں ۶۴۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا جو کہ یونیا کے قرب و جوار میں ہے۔ اس نے یہ علم اہلِ مصر و اہلِ فینیشیا' اہلِ کریٹ اور یونیا سے حاصل کیا۔ نجوم اور ہندسہ میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وجود' موجودات اور عناصر کے متعلق بھی اس کے اقوال ہیں۔ کسوف (سورج گرہن) اور خسوف (چاند گرہن) کے حساب کا طریقہ بھی اس نے ایجاد کیا۔ اس کے بعد بہت سے لوگ اس میں مشغول اور مشہور ہوئے جو اس کے تلامذہ میں سے ہیں۔ منجملہ ان کے ارخیلاوس ہے جو طبیعیات کو یونیا سے ایتھنز میں لایا۔ اسی کا شاگرد سقراط تھا جس کی ولادت ۴۶۹ قبل مسیح میں ہوئی تھی۔

اسی زمانہ میں ایتھنز پر اہلِ قدیمونیا قابض ہو گئے تھے' اس لیے دونوں کے ملنے سے طبائع میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ ہر ایک شخص دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ اہلِ ایتھنز کی شکست اور بھی فلسفہ کی ترقی کا باعث بنی کیونکہ حکومت چھن جانے کے بعد اب ملک میں ان کی عزت و وقار بھی نہ تھا' اس لیے اپنی طبیعت کا غیر معمولی بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اور شکستہ دل کو بہلانے کے لیے انہوں نے اس سے زیادہ کوئی اور طریقہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ فلسفہ میں مشغول ہو جائیں۔ (تمدن عرب موسیو لی بان) طالیس نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ سقراط نے اس کو ترقی دی۔ اس نے فلسفہ کے تین حصے کیے:

(۱) وہ مسائل جو انسان سے من حیث الانسان متعلق ہیں۔
(۲) وہ مسائل جو انسان سے بحیثیت مدبر اور باپ ہونے سے متعلق ہیں۔
(۳) وہ مسائل جو بحیثیت ایک فرد جماعت ہونے کے اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

یہ روح کی قدامت کا بھی قائل تھا۔ یونانی اسی کو فلسفہ ادب عملی کا موجد کہتے ہیں۔ (جرجی زیدان) سقراط کے فلسفہ کو آگے بڑھانے والا اس کا شاگرد خاص افلاطون ہوا۔ سقراط نے اپنی تعلیم و تحقیق کو مدون نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد اس کے تلامذہ نے اس کے اقوال و تقاریر کو کتابوں میں جمع کرنا شروع کر دیا لیکن ان کے اور ان کے استاد سقراط کے درمیان بعض اقوال کی تفسیر و تشریح میں اختلاف پیدا ہو گیا اور آخر کار اس اختلاف کا نتیجہ کیرینی، کلبی اور اشراقی تین فرقوں میں تقسیم ہو جانے کی صورت میں نمودار ہوا۔ آخر الذکر اشراقی فرقہ تھا اور یہی ان تینوں میں باقی رہا اور مشہور ہوا۔ اس کو افلاطونی بھی کہتے ہیں کیونکہ اس فرقہ کا بانی افلاطون تھا جس کی ولادت ۴۲۸ ق م میں ہوئی۔ اس کا فلسفہ حکماء ثلاثہ کے مذاہب سے انتخاب کردہ ہے۔ طبیعیات میں ہیسبر فلیطس، الٰہیات میں فیثا غورث اور فلسفہ ادب عملی و اخلاق میں سقراط۔ یہی ہیں حکماء ثلاثہ۔ (تمدن عرب)

افلاطون کے تلامذہ میں بھی کئی گروہ ہوئے جن میں سے سب سے زیادہ مشہور گروہ مشائین کا ہے۔ اس فرقہ کا بانی ارسطو ہے جس کی نسبت حکماء کے اقوال یہ ہیں کہ یہ تمام قدماء فلاسفہ سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اہلِ عرب اس کو معلم اوّل کہتے ہیں۔ اس کی ولادت ۳۸۴ ق م میں اور ۳۲۲ ق م میں ہوئی۔ ارسطو نے دیگر علوم یونان کے منتخب علماء سے حاصل کیے لیکن فلسفہ صرف اپنے استاد افلاطون سے حاصل کیا۔ ارسطو نے فلسفہ و منطق کو بہت زیادہ ترقی دی اور اسے بام عروج پر پہنچایا۔ اس نے ان علوم کی ہر بحث کو نہایت تحقیق و تفتیش کے ساتھ لکھا اور عقلی و نظری مسائل کی نہایت عمدہ اور نفیس توضیح کی۔ وہ افلاطون کی طرح عبارت آرائی اور الفاظ کی طرف خیال نہ کرتا تھا بلکہ اصل مقصد کو ہر ممکن طریقہ سے واضح کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب ارسطو نے اپنا فلسفہ شائع کیا تو تمام لوگ اس پر ذوق و شوق سے ٹوٹ پڑے اور اسے بے حد پسند کیا۔ اسکندر مقدونی نے بھی فلسفہ کی تعلیم ارسطو ہی سے حاصل کی۔ وہ اس کی بہت کچھ مالی امداد بھی کرتا تاکہ یہ طبابت و علم الحیوانات کی کماحقہ تحقیق کر سکے۔ اسکندر کی فتوحات نے یونانیوں کی طبائع میں ایک اور جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ اس کے علاوہ اسکندر بابل،

فینیشیا، فارس اور ہندوستان سے بھی معلومات کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لایا تھا جن کی وجہ سے فلسفہ کی ترقی میں بڑی مدد ملی کیونکہ ارسطو نے اس ذخیرہ میں سے قابلِ اعتماد مواد اخذ کر کے اسے اپنے فلسفہ میں شریک کر دیا۔ ارسطو نے ان جملہ علوم میں جو اس زمانہ میں رائج تھے کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً طبیعیات، فلسفہ، منطق وغیرہ۔ ارسطو کا تحقیق کردہ فلسفہ و منطق عرصہ دراز تک علمی دنیا کا سکّہ رائج الوقت بنا رہا۔ اس کے بعد جتنی قومیں بھی آئیں وہ سب فلسفہ و منطق میں ارسطو کی خوشہ چین ہیں۔

(تمدن عرب موسیو گستاؤلی بان)

فلسفہ اسکندریہ میں

سکندر کی فتوحات نے جہاں کلدانی، بابلی، ہندی، فارسی اور دیگر علوم یونان میں پہنچائے وہاں یونانی علوم، فلسفہ و منطق وغیرہ کو بھی دیگر ممالک میں پھیلا دیا۔ یونانیوں کے فاتح قوم ہونے کی وجہ سے ان کے علوم مفتوح اقوام نے حاصل کیے اور اسکندریہ و انطاکیہ اور بیروت وغیرہ میں درسگاہیں قائم ہوگئیں لیکن اسکندریہ کی درسگاہ سب سے زیادہ مشہور تھی۔ جب ۳۲۳ قبل مسیح میں سکندر کا انتقال ہو گیا اور وہاں علماء کی وہ قدر و منزلت باقی نہ رہی تو یونان کے علماء مصر، شام اور عراق وغیرہ میں، جس نے جہاں جہاں اپنی قدردانی کے موافق حالات دیکھے، منتقل ہو گئے۔ لیکن تمام مشرقی یونانی سلطنتوں میں اسکندریہ میں بطالسہ فلسفہ کے بہت زیادہ قدردان تھے۔ اس خاندان کا پہلا حکمران سوتر نہایت انصاف پسند اور علم دوست تھا۔ یہ ۲۸۵ ق م سے ۳۰۶ ق م تک حکمران رہا۔ اس کے زمانہ میں بلاد یونان سے جوق در جوق علماء اس کے پاس آئے اور اس نے ان کا نہایت ادب و احترام کیا اور عزت بخشی۔ اسکندریہ کے خزانے ان کے لیے کھول دیئے، اس لیے یونان کے بعد اسکندریہ ہی تمام یونانی علوم کا مرکز بن گیا۔

سوتر نے اپنے ایک ہم نشین کو حکم دیا کہ وہ اطراف و اقصائے عالم سے جتنا بھی ممکن ہو کتابیں جمع کرے اور ایک کتب خانہ بنائے۔ چنانچہ اس نے تعمیل حکم کی اور جتنی بھی کتابیں مل سکتی تھیں تلاش و جستجو اور جدوجہد کر کے جمع کیں اور اسکندریہ کا

مشہور زمانہ کتب خانہ قائم کیا۔ اس میں وہ تمام کتابیں بھی رکھی گئیں جو اسکندر اعظم اصطخر سے (ایران سے) لایا تھا۔ سوتر کے اس ہم نشین مصاحب کا نام دمیتریوس تھا۔ اسکندریہ میں علوم کی ترقی سوتر اوّل کے زمانہ سے لے کر یعنی ۳۰۶ ق م تا ۶۴۰ بعد مسیح نو سو سال تک ہوتی رہی جبکہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو اسلامی مملکت میں شامل کر لیا لیکن ۳۰۶ ق م سے لے کر ۳۰۹ ق م تک یعنی اہلِ روما کے مصر کو فتح کرنے تک یہاں یونانی علوم کی تعلیم ہوتی رہی اور اس کے بعد پھر اہلِ روما کا ذہن ہی فلسفہ پڑھایا جانے لگا اور وہاں کے دیگر علوم روما میں منتقل کر دیئے گئے۔

تیسری صدی کے وسط میں دولت ساسانیہ کے حکمران شاپور ابن اردشیر اور روم کے درمیان جنگ ہوئی جس میں شاپور کو فتح نصیب ہوئی۔ وہ بہت سے رومیوں کو گرفتار کر کے اپنے ملک میں لے آیا اور مقام اہواز میں ان کے لیے ایک شہر آباد کیا۔ چونکہ یہ لوگ اہلِ قلم اور اہلِ علم تھے اور شاپور علم کا بڑا قدردان تھا اس لیے اس نے ان کی بے حد قدر و منزلت کی۔ انہی علماء کے ذریعہ فارس کو اس کے گمشدہ علوم واپس ملے اور فلسفہ یونان ایران پہنچا۔ (ابو الفداء ص ۵۰ ج ۱)

اس کے بعد جب ۵۳۱ء میں کسریٰ نوشیروان عادل تخت حکومت پر بیٹھا اس وقت دولت بازنطینی یعنی مشرقی سلطنت روم کا حکمران قیصر روم جسٹینین برسر اقتدار تھا۔ یہ شخص فلسفہ کا جانی دشمن تھا۔ اس نے ایتھنز اور اسکندریہ کے تمام مدارس بند کرا دیئے اور کتب خانے ضائع کر دیئے۔ اس وقت ان مقامات کے تمام بڑے بڑے فلسفی دنیا کے دوسرے بلاد و ممالک میں پھیل گئے جن میں سے سات بڑے بڑے عالم کسریٰ نوشیرواں کے دربار میں بھی آئے۔ (موسیو لی بان و جرجی زیدان) کسریٰ نے ان کی بڑی عزت کی اور حکم دیا کہ علومِ یونانی کو وہ لوگ فارسی زبان میں منتقل کریں چنانچہ منطق اور طب کا ان لوگوں نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ (الفہرست ص ۲۴۴)

اس طرح فلسفہ و منطق اور طب وغیرہ ایران پہنچے۔ چونکہ ملوک ساسانیہ علم دوست اور علم کے قدرداں تھے اس لیے ان علوم کو وہاں خوب ترقی ہوئی۔ جب عربوں نے ایران و شام پر قبضہ کیا تو وہاں ان علوم کا ذخیرہ ملا اور جب انہیں اپنے تمدن کے زمانہ

میں علوم دنیا سے دلچسپی پیدا ہوئی تو انہوں نے ان تمام فلسفہ و منطق اور طب کی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ (موسیولی بان)

مسلمانوں کی توجہ فلسفہ کی طرف ابتداءً منصور کے زمانہ میں ہوئی جو خلفاء بنی عباس میں دوسرا خلیفہ تھا۔ اس کے زمانہ میں برامکہ نے پیش قدمی کی اور خلفاء سے قبل ہی انہوں نے تراجم کی بنیاد ڈالی۔ لیکن خلیفہ مامون عباسی جو کہ علومِ عقلیہ سے بے حد دلچسپی رکھتا تھا اور جس کو یہ ذوق ایرانیوں سے بھی ملا تھا' اس نے شاہ روم کے پاس ایک خط بھیجا جس میں فلسفہ و منطق و قدیم علوم کی کتابیں طلب کی تھیں۔ ایسی تمام کتابیں شاہ روم نے ایک علیحدہ مکان میں منتقل کرا دی تھیں جو برسہا برس سے اسی حالت میں پڑی تھیں۔ جب مامون کا یہ خط اسے ملا تو اس نے کچھ پس و پیش کیا لیکن اس کے متعلق لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یہ کتابیں ضرور مامون کے پاس بھیج دے کیونکہ ان کے خیال میں معقولات کی یہ تمام کتابیں مذہب کو برباد کرنے والی تھیں۔ شاہ روم نے ان کا یہ مشورہ تسلیم کیا اور یہ کتابیں مامون کے پاس بھیج دیں۔ مامون نے حجاج بن مطر البطریق کو حکم دیا کہ ان کتابوں میں سے جس کو وہ پسند کرے اس کا وہ ترجمہ کرے۔

(الفہرست ص ۲۴۳)

مامون کی تقلید بغداد کے اکثر امراء دولت نے کی' اسی لیے وہاں عراق' شام' فارس' روم اور ہندوستان سے ترجمہ کرنے والے علماء و حکماء و فلاسفہ اور برہمن پنڈت آنے لگے اور ہر زبان کی کتابوں کے تراجم کرائے گئے۔ مامون کے بعد بھی چند اور خلفاء عباسیہ کا یہی طریقہ رہا اور تمام اہم کتابیں علوم قدیمہ کی عربی میں ترجمہ کرائی گئیں۔ اگرچہ فلسفہ و منطق کی ترقی دور مامونی میں ہوئی لیکن اس کی بنیاد عباسی خلیفہ مہدی کے زمانہ میں ہی پڑ چکی تھی جبکہ بانی اور ابن دمیان وغیرہ کی تصنیفات کا ترجمہ ہونے سے لوگوں میں ایک قسم کی گمراہی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ اسی وقت خلیفہ مہدی نے علمائے وقت کو حکم دیا تھا کہ وہ ایسی کتابیں تصنیف کریں جن کے ذریعہ ان مذاہب باطلہ کا رد ہو سکے۔ اس وقت علم کلام کی بنیاد قائم ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ علم وسعت اختیار کرتا گیا اور اس میں لازماً منطقی و فلسفی مباحث شامل ہو گئے اور آخر کار منطق و فلسفہ علومِ دینیہ

کے نصاب کا ایک لازمی جزو بن گئے کیونکہ ان کے بغیر اس وقت بھی مذاہب باطلہ کا رد ممکن نہ تھا۔ علم کلام میں وجود باری تعالیٰ، اس کے وجوب، قدامت، اس کی ازلیت و ابدیت اور صفات باری عزاسمہ سے بحث کی جاتی ہے اور ان جملہ امور کو فلسفی و منطقی دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس علم میں نبوت، ختمِ نبوت اور ان کے دلائل نیز جملہ عقائد دین شامل کر دیئے گئے۔

فلاسفہ اسلام

ابتداءً مسلمانوں نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی شروح و تعلیقات کو بھی پڑھا جو خود یونانیوں کی تصنیف کردہ تھیں۔ یہ کتابیں عموماً منطق، طبیعیات، الٰہیات اور اخلاقیات سے متعلق تھیں۔ عربوں نے ان تصنیفات کو پڑھنے کے ذوق و شوق میں لاطینی و یونانی زبانیں بھی سیکھ لیں، اس طرح عربوں کے اوّل اساتذہ یونانی ہیں لیکن ان کی طبائع میں اس قدر جدت خیال اور تحصیل علم کا ولولہ تھا کہ انہوں نے بہت دنوں اس شاگردی کی حالت پر جو یورپ میں ازمنہ وسطیٰ میں کافی سمجھی گئی تھی، قناعت نہ کی اور بہت جلد اس محدود دائرہ سے باہر نکل آئے۔ عربوں نے جو مستعدی تحصیل علوم میں دکھلائی وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ اس خاص معاملہ میں بہت کم اقوام ان کے برابر ہوئی ہیں لیکن ان سے آگے بمشکل ہی کوئی نکل سکی۔

(موسیو لی بان)

غرض! یونانیوں کے ان علوم میں بھی انہوں نے بہت جلد عبور حاصل کر لیا اور تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا جیسا کہ عنقریب آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔ فی الوقت صرف ان مشاہیر کا تذکرہ کیا جاتا ہے جنہوں نے فلسفہ اور منطق میں بے نظیر ترقی کی۔ ان میں سب سے پہلے یعقوب بن اسحٰق کندی کا نام آتا ہے۔ یہ خالص عربی نژاد تھا اور مشہور شاہان کندہ کی اولاد میں سے تھا۔ اس کا لقب "فیلسوف عرب" ہے۔ یہ مامون و معتصم کے زمانہ میں ہوا۔ طب، حساب، منطق، نجوم اور موسیقی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس وقت تمام مسلمانوں میں صرف یہی ایک فلسفی تھا جو اپنی تصنیفات میں ارسطو کے

پہلو بہ پہلو چلتا تھا۔ اس نے جملہ علومِ عقلیہ میں دو سو اکتیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ ترجمہ کا بھی بڑا ماہر تھا۔

اس کے بعد ابو نصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ ہوا جو اہلِ اسلام کا مایہ ناز فلسفی اور مسلمہ امام منطق ہے۔ یہ فلسفی بھی چوٹی کا تھا اس کو بھی وہ جملہ علوم حاصل تھے جو کندی کے پاس تھے، بلکہ یہ اس سے بھی بڑا عالم ہوا ہے۔ خاص طور سے منطق میں اس کا درجہ بلند ہے۔ مسلمانوں میں اس کو وہی درجہ اور مرتبہ حاصل ہے جو اہلِ یونان میں ارسطو کو ہے۔ اس نے ایسے ایسے نئے عنوانات و موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھیں جو اس سے قبل کسی کے دماغ میں نہ آئے۔ مدنیت جدیدہ کے بارے میں اہلِ یورپ کا یہ خیال ہے کہ یہ ان کی ایجاد ہے، حالانکہ ایک ہزار سال قبل فارابی اس پر مکمل طور پر لکھ چکا ہے اور ابنِ خلدون نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کو لکھا ہے۔ (جرجی زیدان) یہ یونانی زبان کا بھی ماہر تھا۔ اس کے زمانہ تک یونانی کتابوں کے جس قدر ترجمے ہو چکے تھے ان کی اغلاط کو اس نے درست کیا اور ان ترجموں کو صحیح کر دیا، اسی لیے اس کا لقب معلم ثانی رکھا گیا۔ فارابی کی ولادت شام میں ہوئی اور نشوونما مقام فاراب میں ہوئی اور وہیں اس کی اصل بود و باش تھی۔ فاراب ترکستان کا ایک مشہور مقام ہے۔ اپنے نسب کے اعتبار سے یہ فارسی النسل تھا۔ (کشف الظنون)

اس کے بعد شیخ الرئیس ابن سینا متوفی ۴۲۸ھ ہوا۔ اس کی تصنیفات کی تعداد ایک سو کے قریب ہے جن میں سے چھبیس صرف فلسفہ میں تھیں۔ یہ منطق اور طب کا بھی امام ہے۔ قانون شیخ اور کلیات طب میں اس کی غیر فانی تصنیفات ہیں جو آج کے زمانہ میں بھی طبی مدارس میں داخل نصاب ہیں۔ فلسفہ کے علماء میں چوٹی کے ایک عالم حجۃ الاسلام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ یہ فلسفہ اشراق اور تصوف کے امام ہیں۔ ابتداء میں ان کی شہرت محض ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے ہوئی لیکن بعد میں ان پر تصوف غالب آ گیا۔ یہ اپنے دبدبہ علم میں اپنا نظیر اور ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ (کشف الظنون)

مسلمانوں نے فلسفہ و منطق کا علم حاصل تو کیا لیکن عوام ایسے لوگوں سے بدظن

رہتے تھے جو یہ علوم حاصل کرتے تھے۔ (ابن خلکان ص ۳۴۳ ج ۲)

ان لوگوں کو مسلمانوں میں کبھی وہ مقام و وقار حاصل نہ ہو سکا جو فقہاء، مفسرین اور محدثین علوم دینیہ و شرعیہ رکھنے والوں کو حاصل تھا کیونکہ یہ لوگ عموماً بے باک تھے اور ایسی باتیں جو اسلامی و مذہبی معتقدات کے خلاف ہوتی تھیں، بے روک ٹوک کہہ جاتے تھے۔ خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات پر بھی فلسفہ و منطق کا اثر پڑا اور اسلام دشمن طبقہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ فلسفہ کی آڑ میں اسلامی عقائد کو توہمات کا نام دے کر جیسا چاہیں اس پر اعتراض کریں۔ اس لیے علمائے اسلام اس جانب متوجہ ہوئے کہ وہ اپنے علم کلام کو فلسفہ و منطق کے اعتراضات سے بچائیں۔ چنانچہ انہوں نے اس علم کے جملہ مباحث پر فلسفیانہ و منطقی دلائل قائم کیے اور فلسفہ و منطق کو اس درجہ علم کلام سے مطابقت دی کہ یہ دونوں علم اسلامی سانچے میں ڈھل گئے۔ اس کے ساتھ ان کے باطل نظریات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس لیے یہ دونوں علم اسلامی عقائد و تعلیمات کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے جیسا کہ مذہب عیسوی کو پہنچایا تھا۔ جبکہ ۵۳۱ء میں عیسائی زیادہ سے زیادہ اپنے مذہب سے منحرف ہونے لگے تھے اور جس کے نتیجہ میں قیصر روم نے فلسفہ و منطق کی جملہ کتابیں مقفل کرادی تھیں اور ان کا پڑھنا جرم قرار دے دیا تھا۔ یہ وہی کتابیں تھیں جو خلیفہ عباسی مامون نے قیصر روم سے منگوائی تھیں اور قیصر روم نے مامون کی یہ درخواست قبول کرکے ان کتابوں سے چھٹکارا حاصل کیا اور اپنی دانست میں اسلام کو عظیم نقصان پہنچانے کا ہتھیار سپلائی کر دیا تھا۔

ادھر اندلس میں فلسفہ کا داخلہ اموی خلیفہ عبدالرحمٰن اوسط کے زمانہ میں ہوا۔ ابو عبیدہ ابن سمیہ متوفی ۳۱۵ھ، مسلم بن احمد متوفی ۳۹۸ھ، مشہور فلسفی ہیں۔ مسلم بن احمد تو علم ریاضی میں بھی ماہر تھا۔ ابن سمح غرناطی، ابن الصفار اور زہراوی مصنف "کتاب الارکان" اس کے مشہور تلامذہ گزرے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت ریاضی، ہندسہ اور نجوم کے عالم تھے۔ اندلس میں بھی فلسفہ بغداد ہی کے راستہ پہنچا۔ اندلس کا سب سے پہلا فلسفی ابن باجہ متوفی ۵۳۳ھ ہے۔ یہ ابن صائغ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بہت بڑا فلسفی تھا۔ اس کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت کافی ہے لیکن ان سب میں زیادہ مشہور اور ماہر ابن

رشد متوفی ۵۹۵ھ اور ابن طفیل وغیرہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے نہایت بیش قیمت تصنیفات کیں جو درحقیقت فلسفہ یورپ کی بنیاد ہیں۔ ابن رشد کے بارے میں موسیو لی بان لکھتے ہیں:

"وہ عرب فلسفی جس کی تصنیفات کا یورپ پر بہت زیادہ اثر پڑا ہے ابن رشد کے نام سے مشہور ہے۔ ابن رشد کو ارسطو کا شارح خیال کیا جاتا ہے لیکن میری رائے میں شارح بعض اوقات اپنے استاد پر فوقیت لے گیا ہے اور بہت سے مسائل مختلفہ میں اس کی رائے ارسطو سے کہیں زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔"

ابن رشد کے بارے میں موسیو رینان کی بھی کچھ اسی قسم کی رائے ہے۔

طب

طب ایک ایسا علم ہے جس کی طرف ہر انسان فطرتاً احتیاج رکھتا ہے' اسی لیے یہ علم ہر قوم میں کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا مگر مورخین کا بیان ہے کہ اس کی بنیاد بابل میں کلدانیوں نے رکھی اور ان ہی سے پھر تمام دیگر اقوام میں جاری ہوا۔ زمانہ قدیم میں مختلف ممالک میں علاج کے طریقے بھی الگ الگ تھے۔ اس وقت اکثر امراض کا علاج جھاڑ پھونک اور دیوتاؤں کے ذریعہ کیا جاتا تھا جیسا کہ یونان' عرب اور ہندوستان میں ہوتا تھا' لیکن کلدانی سب سے پہلی قوم ہے جس نے امراض کا علاج دواؤں کے ذریعہ تلاش کیا۔ وہ لوگ اپنے مریضوں کو عام راستوں پر لاکر ڈال دیتے تھے تاکہ اگر وہاں سے کوئی ایسا مسافر گزرے جو اس مرض میں مبتلا رہ چکا ہو تو وہ یہ بتلا دے کہ اس نے کس دوا اور کس چیز سے شفا پائی؟

پھر بابل سے یہ علم فارس' عرب اور یونان وغیرہ میں منتقل ہوا لیکن اس وقت تک بھی یہ مدون نہیں ہوا تھا۔ سینہ بہ سینہ چلتا رہا۔ جب یونانیوں کی اہلِ مورہ سے مشہور لڑائی ہوئی اس کے بعد ہی سے اہلِ یونان نے طب کی تدوین کی طرف توجہ کی اور وہ اسے علم طبیعیات کی ایک شاخ تصور کرنے لگے۔ آخر بقراط حکیم متوفی ۳۵۷ قبل مسیح

نے اس کو مرتب کیا اور صحیح اصولوں پر اس کی بنیاد قائم کی۔ اس لیے اس کا لقب ابو الطب (طب کا باپ) پڑ گیا۔ اس نے ملک شام و افریقہ کا سفر کیا اور اہلِ بابل اور مصریوں کی طب حاصل کی۔ ان تمام طبوں کو اس نے طب یونانی سے ملا کر کتابیں لکھیں جس میں اس نے نباتات و معدنیات کی تشریح کی ہے۔ معالجہ کے اصول میں اس نے طبیعت پر اعتماد کیا ہے، اس کے علاوہ فصد، داغ اور حقنہ وغیرہ سے بھی علاج کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کی یہ تصنیفات جن کی تعداد باختلاف روایت مورخین بیس سے ستاسی تک ہے، عرصہ دراز تک طب کا ماحصل اور لب لباب تصور کی جاتی رہیں۔ یونان کے بڑے بڑے فلاسفہ ارسطو وغیرہ بھی اسی پر اعتماد کرتے تھے اور تمام اطباء کا دارومدار اسی پر تھا تاآنکہ اسکندریہ کا مدرسہ قائم ہوا اور یہاں فن طب نے بے حد ترقیاں کیں۔

اسکندریہ ویسے بھی طب کے لیے ایک سازگار جگہ تھی کیونکہ اہلِ مصر پہلے ہی سے فن تشریح میں کمال پیدا کیے ہوئے تھے۔ جب برغاموس کے مدرسہ میں طب کی تعلیم شروع ہوئی تو یہاں پر عرصہ دراز تک بقراط کی تصانیف ہی پڑھائی جاتی رہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے فن تشریح میں اس پر گرانقدر اضافے کیے۔ ۱۳۰ء میں بمقام برغاموس جالینوس پیدا ہوا۔ اس نے علم طب اپنے باپ سے حاصل کیا۔ بعدازاں اس نے اسکندریہ وغیرہ کی سیاحی کی اور علم تشریح حاصل کر کے ۱۵۸ء میں پھر برغاموس واپس آیا۔ یہ بے مثل طبیب تھا۔ اس نے بڑے بڑے معرکہ الآراء معالجات کیے اور کامیابی حاصل کی جس کی وجہ سے اس کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل گئی۔ طب کی ترقی میں اس کی عظیم خدمات ہیں۔ اس نے اس علم میں بہت سی تصنیفات کیں جن میں سے سولہ بہت ہی زیادہ مشہور ہیں۔ دیگر حکماء قدیم کے مقابلہ میں جالینوس کے نظریات و تحقیقات طب جدید کے معیار پر زیادہ صحیح اترتے ہیں۔

اس کے بعد یہ علم فارس پہنچا کیونکہ انہوں نے اہلِ بابل پر غلبہ حاصل کر لیا تھا جو کہ طب کے بانی خیال کیے جاتے ہیں۔ پھر جب شاپور اور روم میں جنگ ہوئی جس میں شاپور کو غلبہ و فتح حاصل ہوئی اس وقت یہ بہت سے علماء کو گرفتار کر کے ایران لے آیا اور روم سے فلسفہ و منطق اور طب کی کتابیں منگوا کر ان علماء سے ان کا فارسی میں ترجمہ

کرالیا۔ کسریٰ نوشیرواں کے زمانہ میں جب روم کا علمی ذوق تباہ ہوا اور وہاں علم کی کساد بازاری ہوئی تو اس وقت بہت سے علماء روم سے منتقل ہو کر کسریٰ کے دربار میں پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی طب وغیرہ یونانی کتابوں کا ترجمہ کسریٰ کے اشارے پر کیا۔ اس طرح طب مکمل طور پر فارسی زبان میں آ گئی۔ سرزمین ایران میں طب کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی اور یہاں کے لوگوں نے اسے بڑے ذوق و شوق سے حاصل کیا۔

دوسری طرف اہلِ ہندوستان کا بھی اہلِ ایران سے بڑا میل جول تھا کیونکہ یہ ان کے پڑوسی تھے۔ ایرانیوں نے اہلِ ہندوستان سے بھی طب میں بہت کچھ اخذ کیا' اس طرح یہاں بھی طب کو نمایاں ترقی ہوئی۔ نوشیرواں خود نہایت باذوق اور علم دوست حکمران تھا۔ اس نے صرف یونانی علوم ہی کا ترجمہ نہیں کرایا بلکہ سنسکرت کی بھی بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرالیا۔ (الفہرست ص ۲۲۴)

اس کے زمانہ میں طب کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا شفاخانہ مریضوں کے لیے بنوایا۔ وہاں طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور یونانی و ہندوستانی اطباء دونوں اپنے اپنے یہاں کی طب کی تعلیم دیتے تھے اور اپنے اپنے قاعدہ سے علاج کرتے تھے۔ اس کا نام "مارستان" (شفاخانہ) تھا۔ اس شفاخانہ کو اتنی عظیم شہرت حاصل ہوئی کہ دنیا میں اس کا مدمقابل کوئی دوسرا شفاخانہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی میں بڑے بڑے حکماء و اطباء پیدا ہوئے جو مختلف زبانوں کے عالم و ماہر تھے۔ انہی لوگوں نے خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں ترجمہ کرنے کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

طب اسلام میں

اسلامی دور حکومت میں فن طب کی طرف توجہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں ہوئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۴۸ھ میں منصور کے معدہ میں ایک ایسا زخم پیدا ہو گیا کہ اس کی قوت شہوانی منقطع ہوئی۔ تمام اطباء اس کے علاج سے عاجز ہو گئے۔ اس وقت فارس سے جورجیس نامی ایک عیسائی طبیب کو طلب کیا گیا جو فارس کے مارستان میں افسرالاطباء تھا۔ اس وقت دنیا کا کوئی طبیب اس سے زیادہ قابل نہ تھا۔

یہ نہایت ذہین، ذکی الطبع اور حاذق طبیب تھا۔ اس نے منصور کا علاج شروع کیا جس سے منصور کو شفاء کلی حاصل ہو گئی۔ جورجیس کو تصنیف و تالیف کا بے حد شوق تھا۔ یہ فارسی اور سریانی زبان کے علاوہ یونانی اور عربی زبان سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس نے منصور کے لیے طب کی ایک کتاب یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کر کے پیش کی۔ اس سے پہلے خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں بھی علم طب میں کچھ کتابیں تصنیف ہوئیں لیکن قدیم کتابوں کا ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ وہ صرف عربوں کے تجربات و مشاہدات پر مبنی اور طبع زاد تھیں۔ منصور خلفاء اسلام کا پہلا خلیفہ ہے جس کو قدیم کتابوں کا ترجمہ کرانے کا شوق پیدا ہوا لیکن اس کے زمانہ میں صرف نجوم، ہندسہ اور طب کی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ ابن المقفع نے منصور ہی کے زمانہ میں کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ کیا لیکن فلسفہ و منطق کی کتابوں کا ترجمہ مامون کے زمانہ میں ہوا۔

عربوں کی طبی تصنیفات

اسلام سے پہلے متمدن اقوام میں طب نے درجہ بدرجہ جس قدر ترقیاں کی تھیں مسلمانوں نے ان سب کو حاصل کیا کیونکہ انہوں نے بقراط، جالینوس وغیرہ اطباء یونان اور سریانی و کلدانی طبیبوں کی تصنیفات کا ترجمہ اپنی زبان میں کرا لیا تھا۔ اس کے علاوہ فارس اور ہند کے طبی معالجات و معلومات کا ذخیرہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے بہت جلد اس علم پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا جس کا بہترین نمونہ الملوکی ہے جس کو ابوبکر رازی (جس کو جالینوس عرب کہا جاتا ہے) نے عضد الدولہ کے لیے تصنیف کیا تھا۔ عربوں نے اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے اس علم میں بھی تصنیفات شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے اس علم میں بڑی بڑی تحقیقات کیں اور بکثرت تصانیف کر ڈالیں۔ ابو اصیبعہ نے اپنی تصنیف "طبقات الاطباء" میں ایک مکمل جلد ان ہی مصنفین کے بیان میں لکھی ہے۔ صاحب کشف الظنون اور تراجم الحکماء نے بھی ایک طویل فہرست میں ان کی تعداد بیان کی ہے۔ اگر ان کل اطباء کا شمار کیا جائے جو طبی کتابوں کے ترجمہ سے زوال حکومت اسلام تک ہوئے ہیں تو ان کی تعداد ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچتی ہے جن پر

قلم اٹھانے کے لیے بڑا وقت اور حوصلہ درکار ہے۔ یہاں صرف اہم اور مشاہیر حکماء کے ذکر پر اکتفا کر لینا مناسب ہوگا۔

(۱) الرازی

اطباء عرب میں یہ ایک مشہور و معروف ہستی ہے جس کو جالینوس عرب کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش ۸۵۰ء میں اور وفات ۹۳۲ء میں ہوئی۔ اس نے پچاس سال تک بغداد میں مطب کیا۔ فلسفہ، تاریخ، طب اور کیمیا وغیرہ سب ہی علوم پر اس کی تصنیفات ہیں۔ یہ شخص زبردست محقق تھا اور کل متقدمین کی طبی تحقیقات کا عملی تجربہ شفاخانوں میں مریضوں پر کرتا تھا۔ حمائے جدری حمائے حصبہ پر اس کی تصنیفات عرصہ تک مستعمل رہیں۔ اس کی کتاب "علاج الاطفال" اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اس کی کتابوں میں نئی ادویہ اور نئے معالجات درج ہیں مثلاً حمائے دائمہ میں ٹھنڈے پانی کا استعمال، الکحل اور ریشم سے زخم میں ٹانکہ لگانا وغیرہ۔ الرازی کی مشہور تصانیف میں کتاب "برالاعظم" ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں علم طب کے تمام مسائل موجود ہیں۔

دوسری کتاب "المنصوریہ" ہے جو شہزادہ منصور کے نام پر لکھی گئی۔ اس میں دس کتابیں ہیں:

(۱) تشریح۔ (۲) امزجہ۔ (۳) اغذیہ۔ .(۴) معالجات۔ (۵) حفظ صحت۔ (۶) آرائش جسمانی۔ (۷) لوازمہ سفر۔ (۸) جراحی۔ (۹) سمیات۔ (۱۰) امراض عامہ و حمیات۔

اس کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی میں ہوا اور یہ کئی مرتبہ چھاپی گئیں۔ جو کتاب اس نے چیچک پر لکھی وہ دوبارہ ۱۷۴۵ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔ الرازی کی تصنیفات یورپ کے طبی مدارس میں عرصہ دراز تک درس میں شامل رہیں۔ سترہویں صدی عیسوی تک الرازی اور بو علی سینا کی کتابیں لودین میں پڑھائی جاتی رہیں۔ ان کے بالمقابل یونانی اطباء کی قدر و منزلت یورپ میں زیادہ نہ تھی کیونکہ ان کی تصنیفات سوائے ملفوظات سقراط

(ہپوکرائز) اور خلاصہ جالینوس کے کوئی کتاب درس میں نہ تھی۔

(۲) اطبائے عرب میں سے ایک علی بن العباس بھی تھا جو تقریباً الرازی کا ہمعصر ہے۔ یہ دسویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس نے اپنی ایک تصنیف ملکی نامی چھوڑی جس میں اصول طب اور معالجات دونوں کا بیان ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی تحقیقات بجائے کتابوں کے تجربات کی روشنی میں شفاخانوں میں کی ہیں۔ اس نے ہپوکرائز (سقراط) اور جالینوس کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں اور معالجات میں اکثر ان سے اختلاف کیا ہے۔ اس کی کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۵۳۲ء میں لیون میں طبع کیا گیا۔

(۳) اطبائے عرب میں سب سے زیادہ مشہور بو علی سینا گزرا ہے۔ اس کی تصنیفات اتنے زمانہ تک اثر انداز ہیں جو کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہ ہو سکی۔ آج بیسویں صدی آخری چوتھائی میں بھی بہت سی جگہ اس کی تصنیفات داخل نصاب ہیں اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ یورپ میں بھی بیسویں صدی کے اوّل تک اس کی تصنیفات داخل درس رہیں۔ اسی وجہ سے لوگ اسے "ملک الاطباء" کہتے ہیں۔ یہ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ ابن سینا کثرت عیاشی کی وجہ سے جوانا مرگی کا شکار ہوا۔ اس کی تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ اس کی اہم ترین اور عظیم ترین تصنیف "قانون" کے نام سے موسوم ہے جو آج بھی طبی مدارس میں سکہ رائج الوقت ہے اور اس کے بغیر طب یونانی کی تعلیم نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ یہ علم ہیئت، حفظ صحت، امراض، معالجات اور خواص ادویہ پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیفات کا ترجمہ تمام دنیا کی زبانوں میں ہو گیا اور دس صدی تک طب کا دارومدار انہیں پر رہا۔ فرانس اور اطالیہ کے مدارس میں طبی تعلیم کی بنیاد ان ہی پر رہی، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے بعد تک بھی اس کی تصنیفات بار بار طبع ہوئیں اور انیسویں صدی کے بعد وہاں متروک قرار پائیں۔ (موسیو لی بان) جبکہ ہندوستان میں اس کی تصنیفات تا ایں دم رائج اور داخلِ نصاب ہیں۔

(۴) عربوں کا سب سے بڑا اور مشہور ماہر علم الجراحت ابو القاسم زہراوی ہے۔ یہ اندلسی ہے۔ اس کو اسپین والے البقاسس کہتے ہیں۔ یہ ۱۱۰۷ھ میں فوت ہوا۔ طب میں

اس کی تصنیف "التصریف لمن عجز عن التالیف" ہے جو تیس مقالوں میں ہے، جن میں بہت سے آلات جراحی کی تفصیل ہے جن کی تصاویر بھی اس کی کتابوں میں درج ہیں۔ جراحی میں اس نے پتھری کا نکالنا بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے کسی نے اس کا بیان نہیں کیا۔ ابو القاسم کا نام یورپ میں پندرھویں صدی میں پہنچا لیکن اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ہالر کہتا ہے کہ ان کل جراحوں کا جو چودھویں صدی عیسوی کے بعد گزرے ہیں، اسی کی تصنیفات پر دارومدار تھا۔ اس کی مندرجہ بالا تصنیف کا وہ حصہ جو علم الجراحت سے متعلق ہے، تین کتابوں میں منقسم ہے۔ کتاب اول میں زخم کے جلانے سے بحث ہے۔ کتاب دوم میں ان جراحیوں سے جو چاقو و نشتر سے ہوتی ہیں۔ دانتوں اور آنکھوں کی جراحی، فتق (بچے جننا) اور پتھری نکالنے کا بیان ہے۔ کتاب سوم میں ہڈی ٹوٹنے اور ہڈی اکھڑ جانے سے بحث کی گئی ہے۔ ابو القاسم کی تصانیف کا لاطینی ترجمہ پہلے ۱۴۹۷ء میں اور آخری ۱۸۶۱ء میں طبع کیا گیا۔

(۵) اندلس کے اطباء میں ابن رشد بھی بہت مشہور طبیب ہے۔ یہ ابن باجہ کا شاگرد تھا جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ یہ قرطبہ میں پیدا ہوا اور ۱۱۸۸ء میں وفات پائی۔ اس نے بھی طب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کی شہرت بحیثیت طبیب کے اتنی نہیں جتنی بحیثیت فلسفی و شارح ارسطو ہونے کے ہے۔ اس نے ابن سینا کی شرح لکھی ہے اور تریاق، سمیات اور حمیات وغیرہ پر بھی اس کی تصانیف ہیں۔ ابن رشد کی طبی تصنیفات بار بار یورپ میں چھپتی رہی ہیں۔

عربوں کا علم حفظ صحت

حفظان صحت ہر انسان کی فطری خواہش ہے۔ ایک خوشگوار و پُر مسرت زندگی گزارنے کے لیے اپنی صحت کی حفاظت ضروری ہے تاکہ وہ امراض اور جسمانی تکالیف سے محفوظ رہ سکے۔ عربوں نے اس علم کی بنیاد رکھی اور درحقیقت عرب ہی اس کے موجد ہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ تحقیق کی جا چکی ہے کہ مختلف امراض سے بچنے کے لیے اگر پہلے ہی سے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں تو انسان بہت سے امراض کے

حملوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس طرح امراض جسم انسانی میں پیدا بھی کم ہوں گے اور بہت سی انسانی جانیں ضائع ہونے سے بچ سکتی ہیں۔

چنانچہ کالرا، چیچک، ٹائیفائڈ وغیرہ امراض سے تحفظ کے لیے ٹیکوں کی ایجاد اسی ثابت و محقق نظریہ کی بنیاد پر ہوئی اور عملاً یہ بڑی حد تک کامیاب و مفید ثابت ہوئے لیکن عرب پہلے ہی اس سے واقف تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس نظریہ کے موجد ہیں جنہوں نے عملی طور پر بھی اس کو ثابت کر دکھایا ہے۔ عربوں کو حفظان صحت کا نظریہ قرآن مقدس سے ملا کیونکہ قرآنی احکام میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو صحت کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر ضروری ہیں مثلاً لباس کی طہارت و نجاست، جسم کی پاکیزگی اس کے لیے مختلف حالتوں میں غسل وضو فرض قرار دیا جس سے سینکڑوں بیماریوں سے تحفظ ملتا ہے۔

اسی طرح شراب اور نشہ آور چیزوں کی حرمت، کم خوری، گندگی سے احتراز و اجتناب بھی ضروری قرار دیا۔ جائے سکونت و جائے قیام کی صفائی و ستھرائی، ہر اجتماع کے موقع پر جسم و لباس کی نجاست و ستھرائی کی ہدایات، خوشبو کا استعمال یہ تمام ہدایات و احکام انسانی زندگی کے تحفظ اور اس کی بہتر صحت کے لیے نہایت مناسب بلکہ ضروری ہیں اور انتہائی مفید صحت اصول ہیں۔

ان کے علاوہ احادیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حفظ صحت پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کے لیے خاص ہدایات دی گئی ہیں، اس لیے عربوں نے اس علم کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے حصول صحت کے لیے کثرت سے شفاخانے بھی تعمیر کرائے۔ یہ شفاخانے نہایت وسیع ہوتے تھے اور بلحاظ آب و ہوا صحت افزا مقام میں تعمیر کیے جاتے تھے۔ بغداد میں شفاخانہ تعمیر کرتے وقت الرازی سے پوچھا گیا کہ وہ بہتر سے بہتر مقام شفاخانہ قائم کرنے کے لیے تجویز کرے تو اس نے اس انتخاب کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا جو اس کی جدت طبع اور حذاقت کی دلیل ہے۔

اس نے گوشت کے ٹکڑے شہر کے مختلف حصوں میں لٹکا دیے۔ وہ گوشت شہر کے جس حصہ میں سب سے زیادہ دیر میں خراب ہوا اسی کو اس نے خوشگوار آب و ہوا کا

علاقہ قرار دیا۔ ان شفاخانوں میں طلبہ کو عملی تعلیم دی جاتی تھی اور تجربات سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ یہاں علاج بھی مفت کیا جاتا تھا۔ بعض مخصوص امراض کے لیے علیحدہ اور مخصوص شفاخانے بھی قائم کیے جاتے تھے۔ حفظ صحت کے یہی اصول بعد میں یورپ پہنچے اور مدرسہ طبیہ سلرنو کی بنیاد انہیں اصولوں کی تعلیم پر رکھی گئی جو کہ تمام یورپ میں اوّل درجہ کا خیال کیا جاتا تھا۔ (موسیو لی بان)

عربوں کی علم الادویہ میں ترقیاں

علوم طبیہ عربوں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد سب سے زیادہ ترقیاں فن جراحت، علامات امراض، قرابادین اور ادویات میں ہوئیں۔ انہوں نے بہت سے طریقہ ہائے علاج ایجاد کیے ہیں۔ عربوں سے پہلے امراض کے طریقہ ہائے علاج بھی چند ہی تھے اور ان کے لیے چند گنی چنی ادویات تھیں جن سے کام نکالا جاتا تھا لیکن عربوں نے ان دونوں کو بہت زیادہ ترقی دی۔ علاج کے نئے نئے طریقے دریافت کیے اور بے شمار ادویات معلوم کیں اور ان دواؤں کے استعمال کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔ حمائے دائمہ (ٹائیفائڈ) میں پانی کا استعمال، نباتات کو کسی دوا میں بھگو دینا اور پھر ان کے استعمال سے دوا مریض کے جسم میں پہنچانا مثلاً ابن زہر قبض کے علاج میں انگور کو عرق مسہل میں بھگو کر مریضوں کو کھلاتا تھا۔ قرابادین میں انہوں نے بہت سی دوائیں بڑھائی ہیں جیسے خیار شنبر، سنار، راوند چینی، تمر ہندی، کچلا، حب القرمز، کافور، الکحل وغیرہ جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

ادویہ مرکبہ کے تو گویا وہ موجد ہی ہیں۔ ان سے پہلے کوئی اس کے تصور سے بھی واقف نہ تھا۔ اکثر مرکبات جو یورپ میں پہنچے مثلاً شربت، ضماد، روغن و روغنیات وغیرہ یہ سب عربوں کی دین ہیں۔ فن جراحت کی ابتداء بھی عربوں سے ہی ہوئی اور انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے اوّل دہائی تک ان ہی کی تصنیفات پر یورپ کے مدارس طبیہ کا دارومدار رہا۔ موتیابند کا علاج زجاجیہ کے دبا دینے یا نکال لینے سے، پتھری کا نکالنا، خون کو سرد پانی سے بند کرنا، محرقہ ادویات اور ریشمی ٹانکوں کا استعمال کرنا یہ سب

عربوں ہی کی ایجادات ہیں۔ بے ہوشی کی دوا دے کر عمل جراحی کرنا بھی عربوں ہی کی ایجاد ہے۔ (موسیو لی بان)

عربوں کے شفاخانے

اسلام سے قبل فارس میں کسریٰ نوشیرواں نے مقام جندی سابور میں ایک شفاخانہ قائم کیا جو "مارستان فارس" کے نام سے مشہور ہوا جس میں طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ فارس میں اور کوئی مارستان نہ تھا۔ غلبہ اسلام کے بعد مسلم حکمرانوں نے رعایا کی فلاح و بہبود اور سہولت کے لیے بہت سے شفاخانے قائم کیے۔ سب سے پہلے ولید بن عبدالملک اموی حکمران نے ۸۸ھ میں بمقام دمشق ایک شفاخانہ جذامیوں کے لیے تعمیر کرایا۔ (المقریزی ص ۴۰۵ ج ۲) یہ اپنی نوعیت کا پہلا شفاخانہ تھا۔

دولت عباسی کے حکمران منصور نے فارس کے اطباء کو بلا کر ایک شفاخانہ مجنونوں (پاگلوں) کے علاج کے لیے تعمیر کرایا لیکن سب سے اچھا شفاخانہ ہارون الرشید کے زمانہ میں تعمیر ہوا جو فارس کے جندی سابور کے مارستان کے ڈھنگ پر تھا۔ برامکہ نے بھی اپنے نام سے شفاخانہ تعمیر کرایا اور جس کا مہتمم ایک ہندو مشہور طبیب وو ئید ابن دہن نامی شخص کو مقرر کیا۔ اسی نے سنسکرت کی طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ بغداد کے شفاخانہ کی شہرت نے دوسرے امراء کو بھی شفاخانوں کی تعمیر کی طرف متوجہ کیا۔

متوکل خلیفہ عباسی کے وزیر فتح ابن خاقان نے مصر میں "المتاخر" کے نام سے ایک دارالشفاء قائم کیا۔ ۲۵۹ھ میں ابن طولون نے اپنے نام سے ایک دارالشفاء تعمیر کیا۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی مارستان قائم ہو گئے۔ ان کے علاوہ عیسیٰ وزیر، سیدہ، مقتدر، وزیر ابن الفرات، کافور، عضد الدولہ، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی وغیرہ نے سینکڑوں شفاخانے قائم کیے اور ان کا بہتر سے بہتر انتظام کیا اور عمدہ علاج کی طرف توجہ کی۔ اندلس کا بھی یہی حال تھا، وہاں بھی قریہ قریہ یعنی گاؤں گاؤں، شہر شہر، کثرت سے مارستان بنے ہوئے تھے۔ اسلامی ممالک کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں شفاخانہ نہ ہو۔ ان تمام شفاخانوں میں باقاعدہ اور بہترین علاج ہوتا تھا

اور دوا و غذا میں مختلف مذاہب کے لوگوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بعض شفاخانے ایسے بھی تھے جو فوجوں کی ضرورت کے لیے ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ سلطان محمود سلجوقی کے لشکر میں چالیس اونٹوں پر شفاخانہ رہا کرتا تھا۔ (ابن خلکان ص ۲۷۴ ج ۱ و تراجم الحکماء)

اسلام نے جس تمدن اور معاشرہ کو جنم دیا اس کی بنیاد باہمی ہمدردی، آپس کی خیرخواہی، فلاح و بہبود کے کام اور رفاہ عامہ کے کام ہیں۔ خلق خدا کی خدمت اور ان کی بھی خواہی اسلام کی اعلیٰ تعلیمات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں نے جی کھول کر علمی ترقیوں کے لیے مدارس کے قیام میں حصہ لیا اور وہ کام کیے جن سے انسانیت کو فائدہ پہنچے، اسی لیے انہوں نے شفاخانے بھی بکثرت قائم کیے کہ خلق خدا کی خدمت کا یہ بھی ایک بہترین اور اعلیٰ ذریعہ ہے۔ یہی حال مسافر خانے، سرائے، کنوئیں، تالاب، نہریں اور سڑکیں تعمیر کرانے کا بھی ہے۔

علم ہیئت

اس علم کا تعلق افلاک سے ہے۔ آسمانوں کی تعداد، آسمانوں کی گردشیں، ان گردشوں سے پیدا ہونے والے دائرے، حرکت سیارگان وغیرہ وغیرہ سے ہے۔ یہ علم بھی منجملہ ان علوم کے ہے جن کا شمار عربوں کے نزدیک علومِ دخیلہ میں ہے۔ یہ علم بھی عربوں کو بذریعہ ترجمہ حاصل ہوا۔ قدیم تاریخوں سے جہاں تک معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جب یونان میں علومِ عقلیہ کی کساد بازاری ہوئی تو سوتر اوّل کے عہدِ حکومت میں بہت سے علماء و فضلاء وہاں سے منتقل ہو کر اسکندریہ آگئے اور یہاں کی پُرامن حکومت میں اقامت گزیں و آباد ہوگئے لیکن چونکہ یہاں کی حکومت یونان کی حکومت کے برخلاف ایک شخصی حکومت تھی، اس لیے یہاں پر ان کو وہ آزادی نہ تھی جو انہیں اپنے وطن یونان میں حاصل رہی۔ اس لیے ان کی طبیعتیں مضمحل رہنے لگیں اور ان میں وہ جوش باقی نہ رہا جو ایتھنز کی خوشگوار فضاؤں میں تھا۔ اس وجہ سے ان کی توجہ عقلی و ذہنی علوم کی طرف سے ہٹ کر طبیعیات اور ریاضیات کی طرف مائل ہوگئی۔

اسکندریہ کے مدرسہ میں اسی قسم کے علوم کی ترقی زیادہ ہوئی۔ یہاں کے طلبہ علم

الافلاک، طب، ہندسہ اور جغرافیہ میں خاص طور سے دسترس رکھتے تھے۔ ریاضیات ہی میں اقلیدس صوری نے وہ نام پایا جو آج تک مثل آفتاب روشن ہے۔ اس کی ولادت ۳۳۲ق م میں ہوئی۔ بلادیونان میں اس نے تعلیم حاصل کی۔ بطلیموس کے زمانہ میں دیگر حکماء یونان کے ساتھ اقلیدس صوری بھی اسکندریہ میں داخل ہوا اور یہاں کے مدرسہ میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے اپنی کتاب "اقلیدس" اسی جگہ تصنیف کی، جو آج تک دنیا کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

اس کے بعد ارشمیدس (آرشی میڈیز) اس فن میں مشہور ہوا۔ یہ ۲۸۷ق م میں پیدا ہوا، یہ اقلیدس کا شاگرد تھا اور بہت بڑا ریاضی دان بھی۔ اس کے بعد ابولونیوس متولد ۲۵۰ ق م بیسارفوس متوفی ۱۲۵ق م وغیرہ ریاضی دان ہوئے۔ آخر میں مشہور ریاضی دان بطلیموس ہوا، اس کا زمانہ ۱۵۰ء ہے۔ یہ فلکیات میں بے مثال قابلیت رکھتا تھا۔ مجسطی اس کی مشہور کتاب ہے جس پر تمام دنیا کے علم الافلاک کا مدار رہا۔ اس کی دیگر تصنیفات میں "کتاب الاربعہ" "کتاب العرب" اور "کتاب الجغرافیہ" بھی مشہور ہیں۔

اقلیدس کا ترجمہ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں حجاج بن مطر نے کیا۔ مامون کے زمانہ میں پھر اسحٰق ابن حنین نے اس کا ترجمہ کیا جس کی اصلاح ثابت قرہ نے کی۔ کتاب ارشمیدس کی دس کتابوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ ابولونیوس کی تصنیف "کتاب المخروطات، کتاب قطع السطوح و قطع الخطوط اور انسبہ المحدودۃ والدوائر المماسہ" کے تراجم بھی ہوئے۔ بطلیموس کی ان چاروں کتابوں کا بھی ترجمہ کر لیا گیا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ ہیئت و ریاضی کی دیگر کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے جن میں الاسطرلاب المسطح، جرم الشمس والقمر، العمل بذات الحلق، جداول زیج بطلیموس وغیرہ مشہور ہیں۔ ان ترجموں پر مسلمانوں نے اپنے علم ہیئت کی بنیاد رکھی مگر بہت ہی جلد انہوں نے اس میں بھی ترقی کر لی اور وہ یونانیوں کے محتاج نہ رہے، حتیٰ کہ جو رصد گاہ بطلیموس کے زمانہ میں نہایت ترقی یافتہ اور تمام دنیا میں مشہور تھی اور صدیوں تک مشہور رہی جب مسلمانوں نے ترقی کی اور بغداد، دمشق، مصر، اندلس، مراغہ اور سمرقند

وغیرہ میں انہوں نے اپنی رصدگاہیں قائم کیں تو اسکندریہ کی یہ بطلیموسی رصدگاہ ان کے سامنے بے حقیقت نظر آنے لگی۔

خلفاء بنی عباس نے ہیئت و ہندسہ کو بڑی ترقی دی اور دراصل ان ہی کا زمانہ علمی ترقیوں کا زمانہ بھی ہے۔ انہوں نے اقلیدس، ارشمیدس اور بطلیموس کی تمام تصنیفات اور کل علمی کتابوں کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کرایا اور چیدہ چیدہ چوٹی کے علماء کو اپنے دربار میں بلا کر رکھا۔ ہارون الرشید بالخصوص مامون کے زمانہ میں یعنی ۸۱۳ء سے ۸۳۵ء تک بغداد کے مدرسہ ہیئت نے بڑے بڑے کام کیے۔ بغداد اگرچہ اس تعلیم کا مرکز تھا لیکن اور مقامات میں بھی اس علم کی تحقیق ہوئی۔

وسط ایشیا سے لے کر ساحل اطلانتک تک دمشق، سمرقند، قاہرہ، فاس، طلیطلہ اور قرطبہ وغیرہ ان سب ہی مقامات پر ہیئت دان بکثرت موجود تھے۔ لیکن ہیئت کے مشہور مدارس بغداد، قاہرہ اور اندلس میں تھے۔ بغداد کا مدرسہ سب سے پہلا مدرسہ ہے، یہاں کی رصدگاہوں میں جو مشاہدات کیے گئے تھے وہ ایک کتاب میں جس کا نام "زیجلت محققہ" تھا، درج کیے گئے۔ اس کتاب میں جو تحقیقات پیش کی گئی تھیں، وہ بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئیں اور آج کی تحقیقات کے بہت ہی قریب ہیں، مثلاً اعوجاج منطقۃ البروج کا زاویہ نہایت صحت کے ساتھ دریافت کیا گیا جو ان کی تحقیق کے مطابق تیئیس درجہ تینتیس دقیقہ اور باون ثانیہ کا نکلا جو موجودہ تحقیق کے بہت قریب ہے جو کہ ۲۳ درجہ ۲۷ دقیقہ ہے۔

نقطۂ معدل النہار کی تحقیق سے انہوں نے سال میں دنوں کی تعداد تقریباً نہایت صحت کے ساتھ دریافت کرلی تھی۔ دائرہ نصف النہار کی ایک قوس کے ناپنے کا عمل جس میں ایک ہزار سال بعد کامیابی ہوئی عربوں کے وقت میں ہی کیا گیا۔ یہ قوس اسی طرح ناپی گئی تھی کہ ایک مقام سے چل کر مہندس جب اس مقام تک پہنچے جہاں سے قطب ایک درجہ بلند معلوم ہوتا تھا تو ان دونوں کے درمیان کا فاصلہ نہایت احتیاط کے ساتھ صحیح صحیح ناپ لیا گیا۔ مدرسہ بغداد کی اور دیگر تحقیقات میں ان کی وہ تقویمیں تھیں جن میں سیاروں کے بروج درج تھے اور جن میں استقبال معدلین نہایت صحت کے

ساتھ معلوم کیا گیا تھا۔ اس زمانہ کے چند مہندسین کے نام یہ ہیں:

(۱) محمد بن جبر البتانی

اس کی وفات ۹۳۰ء میں ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑا اور مشہور ہیئت دان تھا۔ عربوں میں اس کا وہی درجہ ہے جو بطلیموس کا یونانیوں میں۔ بطلیموس کی طرح اس نے بھی اپنی تصنیف میں اپنے زمانہ کے کل مسائل ہیئت جمع کر دیئے ہیں۔ جو زیچیں البتانی نے بنائی تھیں ان کا ترجمہ لاطینی زبان میں کر لیا گیا اور یورپ میں شائع ہوا۔ لالانڈ البتانی کو منجملہ ان بیس ہیئت دانوں کے شمار کرتا ہے جو تمام عالم میں مشہور ہیں۔

(۲) ابن اماجور

اس کا نام ابوالقاسم عبداللہ بن اماجور ہے۔ یہ بھی علم ہیئت کا بڑا عالم گزرا ہے۔ اس کی تحقیقات کا زمانہ ۸۸۳ء سے ۹۳۳ء تک کا ہے۔ اس کی تصانیف کثرت سے ہیں اور ان میں اس کی مشہور وہ کتاب الزیج ہے جو البدیع کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا بیٹا ابوالحسن علی بن ابی القاسم بھی مہندس تھا۔ اس نے یہ جدید انکشاف کیا تھا کہ چاند کا فاصلہ سورج سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے جو سابق تحقیق بطلیموس کے خلاف تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے بہت سی تقویمیں تیار کی تھیں۔

(۳) موسیٰ ابن شاکر کے تینوں بیٹے محمد، احمد اور حسن بھی زبردست مہندس تھے۔ انہوں نے ایسی صحت کے ساتھ استقبال معدل النہار کو دریافت کیا جو ان سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے سیاروں کی تقویمیں بھی بنائی تھیں۔ ۹۵۹ء میں انہوں نے بغداد کا عرض البلد ۳۳ درجہ اور ۲۰ دقیقہ دریافت کیا جس میں اور حال کی تحقیق میں کل دس ثانیہ کا فرق ہے۔

(۴) ابو ریحان البیرونی

یہ ایک مشہور مسلمان مہندس ہے۔ محمود غزنوی کا خاص مشیر تھا۔ اس کے ساتھ

ہندوستان بھی آیا۔ اس نے دنیا کے بڑے بڑے مقامات کے طول البلد اور عرض البلد کی جدولیں تیار کیں۔ یہ گیارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس کی تصنیفات میں سے دو مشہور کتابیں یورپ میں چھاپی گئیں جن کا نام "الاثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" اور "کتاب الہند" ہیں۔ یہ طبیب اور جغرافی بھی تھا۔ اس کی وفات ۱۰۳۸ء میں بمقام غزنی ہوئی۔

(۵) ابن النبدی

یہ مصری ہے۔ آلاتِ ہیئت بنانے میں ماہر تھا۔ اس کے پاس علم ہیئت سے متعلق چھ ہزار کتابیں اور دو کرہ سماوی بھی تھے۔ ان ہی میں سے کرۂ بطلیموسی تھا جو ساڑھے بارہ سو سال پہلے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی وفات ۱۰۴۳ء میں ہوئی۔

(۶) الزرقال

اندلس کا رہنے والا مشہور مہندس ہے۔ ۱۰۸۰ء اس کا زمانہ ہے۔ اس نے مامون طلیطلہ کے دربار میں رہ کر ایک اسطرلاب تیار کیا جس کا نام مامونیہ رکھا۔ اس نے صرف آفتاب کے نقطۂ اوج کو معلوم کرنے کے لیے دو سو سے زیادہ مشاہدات کیے تھے۔ اسی نے سب سے پہلے یہ انکشاف کیا کہ معدل النہار کا سالانہ استقبال پچاس ثانیہ ہے۔ یہ تحقیق آج بھی اتنی ہی صحیح ہے اور اس کو کوئی غلط ثابت نہ کرسکا۔ الزرقال اپنے بنائے ہوئے آلاتِ ہیئت استعمال کرتا تھا۔ اس نے کئی قسم کی گھڑیاں بھی ایجاد کی تھیں۔

(۷) ابوالحسن مراکشی

یہ ایک افریقی مہندس ہے جس کا زمانہ اوائل تیرہویں صدی عیسوی ہے۔ اس نے مراکش اور قاہرہ اور ان دونوں کے درمیان نو سو فرسخ کے فاصلہ میں واقع ہونے والے اکیس شہروں کا عرض البلد معلوم کیا۔ اس کی مشہور کتاب "ابتداء و انتہاء" ہے جس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا جاچکا ہے۔

(۸) علم ہندسہ و حساب

اسلام سے قبل عربوں کو علم حساب و ہندسہ کی طرف نہ رغبت تھی اور نہ اس کی انہیں کوئی خاص ضرورت تھی۔ ان کے یہاں ایسے علوم بھی نہ تھے جن میں حساب و ہندسہ کے علم کی ضرورت پیش آسکتی ہو۔ سبعین (یعنی ستر) اور ماتہ یعنی سو۔ ان کے یہاں گنتی کے بھاری عدد تھے جن کے ذریعہ سے وہ لامحدود تعداد کو بیان کرتے تھے۔ نزولِ قرآن اور اشاعتِ اسلام کے ساتھ ہی انہیں اس علم کی ضرورت پیش آئی۔ قانون وراثت اور فرضیت زکوٰۃ نے انہیں علم ہندسہ و حساب کی طرف متوجہ کیا کیونکہ بغیر اعلیٰ درجہ کا حساب جانے ہوئے بعض اوقات نہ وراثت تقسیم کی جاسکتی ہے نہ زکوٰۃ ادا کی جا سکتی ہے۔ جب اسلام کو ترقی ہوئی اور خراج و جزیہ وغیرہ کی وصولیابی کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ ضرورت اور شدید ہو گئی۔ یہاں تک کہ ابن توام کا یہ قول بہت مشہور ہوا: "تعلموا الحساب قبل الکتاب"... "علموا صبیانکم الحساب قبل الکتاب" یعنی "کتاب سے پہلے حساب پڑھو۔" عرب میں جو علوم دیگر زبانوں سے نقل کیے گئے انہیں میں سے ایک حساب بھی ہے اور عربوں نے دیگر علوم کی طرح ان میں بھی کمال حاصل کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہندی حساب اور رقوم کو عربی میں منتقل کیا، پھر یہ عربوں کے ذریعہ ہی سے تمام دنیا میں پھیلا۔ (جرجی زیدان)

عربوں نے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، کسور، ذواضعاف اقل مشترک، نسبت، جذر اور لوگارثم وغیرہ جملہ اقسام و انواع حساب میں کمال پیدا کیا۔ جبر و مقابلہ میں تو یہ سب ہی پر سبقت لے گئے بلکہ حساب کی اس نوع کے تو یہ ماہر ہیں۔ ان لوگوں نے اس علم کی دو کتابیں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیں لیکن جب انہوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کتابوں میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں وہ قابلِ اعتماد و قابلِ اعتبار نہیں ہیں اس لیے انہوں نے خود جبر و مقابلہ کے اصول وضع کیے۔ اس میں سب سے زیادہ مشہور کتاب مصنفہ ابو جعفر خوارزمی "الجبر والمقابلہ" ہے۔ اس کے علاوہ ابو کامل، ابن اسلم، ابو حنیفہ دینوری، ابو العباس سرخسی وغیرہ نے اس فن میں بہت کچھ لکھا۔

اہلِ یورپ نے اپنی آخری ترقی کے زمانہ میں اور موجودہ ترقی میں جبر و مقابلہ کا علم بالکل عربی سے حاصل کیا ہے۔ (جرجی زیدان)

مسلمانوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس فن کو علم منطق سے تطبیق دے ڈالی۔ پانچویں صدی ہجری میں ابن الہیثم نے ایک کتاب اس عنوان پر لکھی ہے۔ حسن بن موسیٰ نے ہندسہ سے ایسے مسائل تخریج کیے جن کو اس سے پہلے کسی نے نہیں نکالا تھا۔ مثلاً زاویہ کی تین برابر حصوں میں تقسیم یا خطوط متوالیہ کی نسبت وغیرہ۔

کیمیا و نباتات

ان دونوں چیزوں کا علم طب سے گہرا تعلق ہے بلکہ طب کے تمام تر معالجات کا دارومدار ہی ان دونوں چیزوں پر ہے۔ جب مسلمانوں نے علم طب سے دلچسپی لی تو کیمیا و نباتات کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ یہ لوگ ہند و فارس سے مفرد دوائیں لاتے اور اپنے یہاں ان کا تجربہ کرتے تھے۔ اس کی ابتداء یحییٰ برمکی کے زمانہ میں ہوئی۔ اس طرح انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں قرابادین مرتب کر لی۔ سابور بن سہل متوفی ۲۵۵ھ سب سے پہلا قرابادین مرتب کرنے والا ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں امین الدولہ نے اپنی مشہور قرابادین لکھی۔

یورپ والوں نے مسلمانوں ہی سے ادویہ کے نام سیکھے تھے کیونکہ ان کے یہاں دواؤں کے جو نام مستعمل ہیں وہ ابھی تک اپنے فارسی و عربی الاصل ہونے کا پتا دیتے ہیں۔ اس بات میں ذرا بھی اختلاف نہیں کہ جدید علم کیمیا کے بانی اصل میں مسلمان ہی ہیں۔ پہلے پہل اس علم کو جس شخص نے شروع کیا وہ خالد بن یزید تھا۔ اس سے جعفر صادق نے سیکھا جس کی وفات ۱۴۰ھ میں ہوئی۔ پھر جابر بن حیان ہوا پھر ابو اسحٰق کندی اور اس کے بعد ابوبکر رازی وغیرہ تھے۔ ان لوگوں نے بہت سے کیمیاوی اجزاء دریافت کیے۔ نئے نئے تجربات کیے جن پر جدید کیمسٹری کی بنیاد ہے۔ انگریز بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کیمیاوی مرکبات سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی تیار کیے۔

ابن اثیر ۲۶۹ھ کے واقعہ حبش کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عربوں کی نئی ایجاد

کردہ دواؤں میں ایک روغن ایسا بھی ایجاد کیا گیا تھا کہ اگر وہ لکڑی پر لگا دیا جائے تو آگ اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ (ابن اثیر ص ۱۵۱ ج ۷)

بارود بھی ایک کیمیاوی مرکب ہے۔ مسلمانوں نے ہی اسے ایجاد کیا اور اس کا استعمال بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔ یورپ نے اس کا استعمال مسلمانوں سے سیکھا۔ موسیو لی بان کہتے ہیں کہ علم کیمیا میں عربوں نے جو کچھ یونانیوں سے پایا تھا وہ بہت ہی کم تھا۔ وہ بڑے بڑے مرکبات جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے عربوں نے ہی ایجاد کیے مثلاً الکحل، گندھک کا تیزاب، شورے کا تیزاب، ماء الملوک (اس کی تاثیر یہ ہے کہ یہ سونے کو گلا دیتا ہے۔ یہ گندھک اور شورے کے تیزابوں کا مرکب ہے)، ملح القلی، نوسادر، چاندی کا شورہ، زیبق سلیمانی، راسب الاحمر وغیرہ پر عربوں نے ہی سب سے پہلے کیمیائی عمل کیے مثلاً عرق کشی، تصعید، قلم بندی، پانی میں حل کرنے اور گلانے کے طریقے وغیرہ۔

تاریخ کیمسٹری کی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ علم کیمیا کا موجد لوائی زیر ہے لیکن اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ حقیقت کے خلاف ہے اور صداقت سے دُور ہے۔ اگر عربوں کی کیمیاوی تحقیقات و تجربات اور ایجادات و اکتشافات شائع نہ ہوئے ہوتے تو لوائی زیر کیا کر سکتا تھا۔ عربوں کی یہ تحقیقات لوائی زیر سے ہزار سال پہلے کی ہیں۔

عربوں کا یہ خیال تھا کہ تمام معدنیات ایک ہی قسم کے اجزاء سے بنے ہیں، صرف تناسب و توازن اجزاء کا فرق ہے۔ اس لیے ہم کوشش کرکے ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے اجزاء میں وہی تناسب پیدا کر دیں جو اس دھات کے لیے ضروری ہیں۔ اس اصول پر انہوں نے چاندی یا تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کرنے کے بے شمار تجربات کیے۔ بلاشبہ وہ سونا بنانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے مگر اس سے سینکڑوں نئے مرکبات، نئی دوائیں تیار ہو گئیں اور اس کیمیاوی عمل کے نئے تجربات و نتائج سینکڑوں کی تعداد میں سامنے آئے۔

علم نباتات

ابتداءً عربوں کا علم حیوانات و نباتات محض ارسطو کی کتابوں کی شرح تک محدود تھا لیکن اس کے بعد انھوں نے ارسطو کی کتابوں کو چھوڑ کر خود مشاہدات شروع کر دیئے اور حیوانات، نباتات، فلزات اور متحجرات پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اس علم کا ایک بڑا مشہور عالم قزوینی ہے جس نے ۱۲۸۲ء میں وفات پائی۔ اس کو مشرقیوں کا پلینی کہا جاتا ہے جو ایک رومی مصنف عالم حیوانات ہے لیکن قزوینی سے بھی پہلے ساتویں صدی ہجری میں ابن البیطار علم نباتات کا بڑا ماہر ہوا ہے۔ اس نے علاوہ کتابی علم کے مصر، شام، یونان اور روم کا سفر بھی کیا اور نباتات کی بڑی چھان بین کی۔ مصر میں کامل ایوبی کے زمانہ میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ اس نے ایک کتاب بھی تصنیف کی جو علم نباتات میں بے مثل ہے۔ (طبقات الاطباء ص ۱۳۳ ج ۲)

اہلِ یورپ نے اپنی ترقی کے دور میں بھی باٹنی کا دارومدار اسی کتاب پر رکھا۔ رشید الدین متوفی ۶۳۹ھ بھی اس فن کا بڑا ماہر تھا۔ جس پیڑ پودے کو دیکھتا اس کی فوراً تصویر کھینچ لیتا تھا۔ وہ مختلف ممالک کے جنگلات اور پہاڑوں پر جاتا تھا اور ہر پودے کے پتے، شاخیں، رنگ اور جسامت کے لحاظ سے اس کی تصویر بنا لیتا تھا۔

(المقریزی ص ۴۰۵ ج ۲)

موسیقی

موسیقی کا رواج ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں ملتا ہے۔ اسلام سے قبل عربوں میں بھی بکثرت اس کا رواج تھا مگر جس طرح قرآن کریم کے ایجاز و اختصار اور فصاحت و بلاغت اور معانی و بیان کے اعجاز محاسن نے عربوں کو اس لغو، فحش، پُر از دروغ، جاہلانہ شعر گوئی سے دُور و نفور کر دیا۔ اسی طرح قرآن پاک کی حلاوت لسانی، شیریں بیانی اور اس کے مخصوص طرز ادا اور جاذب قلوب لہجہ نے عربوں کو موسیقی سے بھی بے نیاز کر دیا۔ وہ موسیقی جس میں لہو و لعب تھا، جس سے جنسی جذبات میں تحریک پیدا ہو جاتی

تھی۔ جو محفل عیش و نشاط اور بزم طرب میں رقص و سرود کی شکل میں تھی۔ جس سے انسان کی جنسی آوارگی، ذہنی عیاشی اور کردار کی گراوٹ کو بڑھاوا ملتا تھا۔ قرنِ اول کے مسلمان اس سے قطعاً دُور تھے اور سخت اجتناب کرتے تھے۔ ان کا ذوق غنائی تبدیل ہو کر تلاوت کلام پاک سے سکون پاتا تھا، جس میں ان کی روحانی غذا تھی اور جو ان کے نفوس کو ہر قسم کے عیوب سے بچا کر ان کا تزکیہ کرتا تھا۔

قرآن کریم کے بعد ان کا ذوق نغمہ ریزی حمد و نعت کے اشعار خوانی کی طرف متوجہ ہوا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ محفل رقص و سرود اور موسیقی جلاء قلب کو مٹا کر ان کو زنگ آلود بناتا ہے اور اس سے انسانی مزاج آوارگی کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن جب انہوں نے عرب کے باہر قدم رکھا تو انہیں ہندی، فارسی، یونانی اور رومی راگ و نغموں سے بھی واسطہ پڑا۔ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے برخلاف موسیقی سے دلچسپی لینی شروع کی اور جب بد عمل سلاطین و امراء نے اس میں دلچسپی لی اور موسیقاروں کی ہمت افزائی ہونے لگی تو بہت سے موسیقار پیدا ہو گئے جن میں ابن سریج، غریض، معبد، حکم، فلیح، نشیط اور ابراہیم موصلی بہت مشہور ہیں۔

رفتہ رفتہ علمی حلقوں میں یہ فلسفہ عملی کی ایک شاخ قرار پایا اور فلسفہ کی کتابوں میں یہ بھی ایک علم و فن کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔ تب ہی ہندی و یونانی زبان سے اس فن کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، یہاں تک کہ یہ ایک باقاعدہ اور بااصول علم بن گیا۔ خلفاء اس کی سرپرستی کرنے لگے اور بہت سے منجم اور منطقی و فلسفی وغیرہ اس فن میں مشغول ہوئے۔ مسلمانوں نے اس میں بھی اپنی جدت طرازی دکھلائی اور بعض ایسے نغمے اور دھنیں ایجاد کیں جو پہلے نہ تھیں۔

فارابی نے ایک آلہ لکڑیوں سے بنایا تھا جس سے مختلف قسم کے نغمے پیدا ہوتے تھے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ سیف الدولہ کے دربار میں گیا، وہاں اس کو کوئی پہچانتا نہ تھا۔ اس نے تمام مغنیوں اور موسیقاروں پر عیب لگایا اور ان کا راگ ناپسند کیا۔ سیف الدولہ نے اس سے کہا کہ کیا تم اچھا گانا جانتے ہو تو اس نے اپنے خریطہ سے وہ آلہ نکالا اور بجانا شروع کیا تو تمام حاضرین مجلس بے ساختہ ہنسنے لگے۔ پھر اس کے بعد

اس نے اپنے آلہ کے پرزوں کو الگ الگ کر کے دوسری طرح ترتیب دیا اور بجانا شروع کیا تو تمام حاضرین مجلس زار و قطار رونے لگے۔ پھر اس نے اپنے آلہ کی ترتیب کو بدلا اور بجانا شروع کیا تو سب لوگ سو گئے یہاں تک کہ دربان و محافظ بھی سو گیا اور وہ بے فکری کے ساتھ نکل کر چلا گیا۔ (ابن خلکان ص ۷۷ ج ۲)

مترجمین دورِ عباسی

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں علوم دخیلہ کو جو ترقی ہوئی اس میں اگرچہ عربوں کی ذہانت، ذکاوت، حذاقت اور فطانت کو دخل ہے لیکن اس میں ایک حصہ ان غیر عربی علماء کا بھی ہے جو دوسرے ملکوں سے از خود یا دعوت خصوصی پر مسلم حکمرانوں کے دربار میں آئے۔ یہ لوگ اپنے اپنے ملک کی زبانوں کے ماہر تھے اور انہوں نے ان کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے جو ہندی، فارسی، یونانی اور سریانی وغیرہ زبانوں میں تھیں۔ ہم یہاں کچھ ایسے مترجمین کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

جب خلفاء و سلاطین نے علوم قدیمہ کی کتابوں کا ترجمہ کرانا چاہا تو انہیں اہلِ عراق، شام، فارس اور ہندوستان کے علماء سے بہت زیادہ مدد ملی۔ مترجمین میں سب سے پہلا شخص جورجیس ہے۔ یہ سریانی تھا اور خلیفہ منصور کا معالج خاص تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مارستان فارس سے رشید کے زمانہ میں بلایا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جبریل ہوا۔ یہ نصرانی خاندان سے تھا اور آل بختشوع کہلاتا تھا۔

(۲) آلِ حنین میں حنین بن اسحٰق بہت مشہور ہے۔ یہ تمام مترجمین پر افسر مقرر تھا اور حیرہ کا رہنے والا نصرانی المذہب تھا۔ اس کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ یہ فارسی، عربی، سریانی اور یونانی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس نے جالینوس کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کیا۔ اس کے دونوں بیٹے داؤد اور اسحٰق بھی بہت قابل تھے۔ خاص طور سے اسحٰق نے اپنے باپ جیسا کمال حاصل کیا مگر یہ مخصوص طریقہ سے کتب ارسطو کی تصانیف کا مترجم تھا۔ حنین کی وفات ۲۶۴ھ میں ہوئی اور یہ زمانہ خلیفہ متوکل کا مترجم تھا۔

(۳) جیشی الاعسم، یہ دمشق کا رہنے والا تھا۔ اس نے بھی کتب جالینوس کے ترجمے

کیے۔ یہ طب کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے علم طب حنین بن اسحٰق سے پڑھی۔

(۴) قسطا بن لوقا نصرانی المذہب تھا۔ بعلبک ملک شام کا رہنے والا تھا۔ بہت بڑا فلسفی اور طبیب حاذق تھا۔ یونانی، سریانی اور عربی تینں زبانوں میں اس کو مہارت حاصل تھی۔ اس کا ترجمہ نہایت معتبر مانا جاتا تھا۔ تاریخ، فلسفہ، منطق، فلکیات، جبرو مقابلہ، ہندسہ اور ادب میں بھی اس کی تصانیف ہیں جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔

(۵) آل ماسر جویہ، ان میں ماسر جویہ بصری مشہور ہے۔ یہ ایک حاذق طبیب اور یہودی مذہب کا تھا۔ اس کی مادری زبان سریانی تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عیسیٰ ہوا۔ اس نے ترجمہ کے علاوہ طب میں بہت سی تصانیف کی تھیں۔

(۶) آل ثابت، ان میں ثابت بن قرہ حرانی بہت مشہور ہے۔ طب، فلسفہ و نجوم کا بڑا ماہر تھا۔ سریانی زبان بہت عمدہ جانتا تھا۔ ریاضی، طب اور منطق میں اس کی تصنیفات ہیں۔ یہ خلیفہ معتضد باللہ کے زمانہ میں تھا۔ اس کے بعد قاہر باللہ کے زمانے میں اس کا بیٹا انس بن ثابت ایسا ہی قابل و معزز ہوا۔

(۷) حجاج بن مطر دورِ مامون کے مترجموں میں تھا۔ مجسطی اور اقلیدس کا ترجمہ اسی نے عربی میں کیا جس کو بعد میں ثابت بن قرہ نے تصحیح کیا۔

(۸) موسیٰ بن خالد، یہ ترجمان کے نام سے مشہور ہے۔ جالینوس کی سولہ کتابوں میں سے اس نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ اصطفان بن باسیل، یوحنا بن بختشوع البطریق، یحییٰ بن البطریق، ابو عثمان دمشقی، ابو بشیر متی بن یونس، یحییٰ بن عدی وغیرہ ہیں۔ یہ سب عصر عباسی کے ترجمہ نگار ہیں۔ دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے والے دیگر لوگ تھے۔ فارسی سے عربی زبان میں ابن المقفع ترجمہ کرتا تھا۔ فارسی کے اور بھی مترجمین تھے۔ سنسکرت سے ترجمہ کرنے والے ہندو تھے جن میں منکہ اور ابن دہن مشہور ہیں۔ بنی موسیٰ بن شاکر بھی نہایت قابل اور بہترین ترجمہ کرنے والے تھے۔ یہ تین افراد ہیں: محمد، احمد اور حسن۔ مگر یہ امراء کے یہاں ترجمہ نگار ہیں۔ ان میں سے محمد ہندسہ، نجوم، اقلیدس، مجسطی، فلکیات و طبیعیات میں کامل تھا۔ حسن ہندسہ میں فرد تھا۔ احمد صنعت و دستکاری کا ماہر تھا۔ یہ تینوں بھائی مصنف ہیں۔ انہوں نے ہی مامون کے زمانہ میں زمین کا

محیط معلوم کیا کہ وہ چوبیس ہزار میل ہے جو جدید تحقیق کے قریب ہے۔ آلاتِ رصد کے استعمال میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔

دورِ عباسی کی مترجمہ کتابیں

کتب افلاطون

کتاب السیاست، مناسبات، نوامیس، التوحید، الحسن واللذۃ، اصول ہندسہ وغیرہ۔

کتب ارسطو

قاطیغوریاس، کتاب العبادہ، تحلیل القیاس، کتاب البرہان، الجدل، مغالطات، الشعر، خطابت بالسماء والعالم، الکون والفساد، النفس، الحس والمحسوس، الحیوان، الالٰہیات، الاخلاق، المرارۃ وغیرہ۔

کتب بقراط

الفصول، کتاب الکسر، الامراض الحارہ، الاخلاط، قاطیطیون، الماء والھواء، طبیعہ الانسان۔

کتب جالینوس

جالینوس کی سولہ کتابیں مشہور ہیں۔ کتاب نبض، شفاء الامراض، المقالات الخمس، الاسطقصات، کتاب المزاج، القویٰ الطبیعہ، العلل والامراض، تعرف العلل الاعضاء الباطنہ، کتاب النبض الکبیر، کتاب الحمیات، الحیران، ایام الحیران، تدبیر الاصحاء، حیلہ البر وغیرہ۔

ان تمام میں سے چار کا ترجمہ حبیش نے عربی میں کیا اور باقی بارہ کا حنین نے کیا۔ جالینوس کی اور دیگر اڑتالیس کے قریب کتابوں کا ترجمہ ہوا جن میں سے اٹھارہ

حبیش، چوبیس حنین اور چھ اصطفان بن باسیل نے ترجمہ کیں۔ ان سب کو ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ سنسکرت سے ترجمہ کرنے کے لیے ہندو طبیب و عالم تھے جن میں منکہ، بازیگر، قلبر قل اور سندباد وغیرہ تھے۔ منکہ رشید (ہارون الرشید) کے علاج کے لیے بلایا گیا تھا، پھر وہیں کا ہو رہا۔ یہ فارسی بھی جانتا تھا اور ہندی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں کرتا تھا۔ اس کو ماہوار وظیفہ دیا جاتا تھا۔ صالح بن بہلہ بھی ایک ہندی طبیب تھا۔ شاناق بھی ہندی طبیبوں میں نہایت لائق و قابل تھا۔ بادِ سموم میں اس نے ایک کتاب پانچ مقالوں پر مشتمل لکھی ہے۔ منکہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی ہندی و سنسکرت سے کتابیں ترجمہ کرائی گئیں۔ نبطی، عبرانی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ کرایا گیا۔ ہر زبان کے لیے علیحدہ مترجم تھے۔ خلفاء ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ترجمہ نگار و مصنف کو اس کے ترجمہ و تصنیف کے ہم وزن سونا دیا کرتے تھے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے اس وقت تمام علوم و فنون، فلسفہ، طب، نجوم، ریاضی، ادب، تاریخ وغیرہ کو جو دیگر اقوامِ عالم میں رائج تھے اپنی زبان میں منتقل کرالیا اور متمدن قوموں میں سے کسی کو نہ چھوڑا جس کی زبان سے ان کے علوم کو عربی میں ترجمہ نہ کرالیا ہو اگرچہ زیادہ تر علوم یونانی، فارسی اور سنسکرت زبان سے منتقل کیے لیکن سریانی، نبطی، عبرانی اور لاطینی زبانوں سے بھی کتابوں کے ترجمے کرالیے اور ہر قوم سے وہ علوم اخذ کیے جو ان کے یہاں اچھے تھے۔ فلسفہ، طب، ہندسہ، منطق اور نجوم میں یونانیوں پر ان کا اعتماد تھا۔ نجوم، سیر، آدابِ حکم، تاریخ اور موسیقی میں ان کا اعتماد اہلِ فارس پر تھا۔ ادویات، حساب، نجوم اور قصص میں ہندوؤں پر اعتماد تھا اور فلاحت و زراعت، تنجیم و سحر و طلسم میں نبطیوں پر، کیمیا اور تشریح میں وہ اہلِ مصر کو معتمد خیال کرتے تھے۔ گویا وہ آشور، بابل، مصر، یونان، فارس اور ہندوستان کے تمام علوم کے وارث بن گئے اور سب کو ملا کر انھوں نے ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی جو مسلمانوں کا تمدن کہلایا۔

علمی ترقیوں کی وجوہات

چونکہ خلفاء، علماء اور حکماء کا بے حد احترام کرتے تھے جیسا کہ منصور، ہارون، مہدی، مامون، معتصم، متوکل اور قاہرباللہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علماء و حکماء کی اتنی عزت و قدر کرتے تھے کہ ان کو اپنے برابر مسند پر بٹھلاتے تھے اور ہر طرح ان کی دلجوئی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اگر یہ ناراض ہو جاتے تو ان کو مناتے، وظائف کی مقدار میں اضافہ کرتے اور ہر طرح ان کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خلفاء کی یہ قدردانی کسی بناوٹ یا تصنع کی وجہ سے نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ ان کے دل خود علمی شوق اور جذبہ سے لبریز رہتے تھے اور علم کی لذت سے آشنا تھے۔ جویائے علم رہنے کی وجہ سے وہ ایک سچے طالب علم کہلائے جانے کے مستحق تھے۔

وہ خود بھی عالم ہوتے تھے کیونکہ اسلامی خلافت حاصل کر لینے کے لیے یہ بھی ایک اہم شرط ہے کہ خلیفہ عالم ہو اگرچہ ان لوگوں کی خلافت شرعی نہ تھی بلکہ شہنشاہیت میں تبدیل ہو چکی تھی، نہ ان کے اعمال ہی شرائط خلافت کو پورا کرتے تھے تاہم انہوں نے اپنے منصب کا نام "خلافت" ہی باقی رکھا تھا اور اسی مناسبت سے وہ علم حاصل کرتے تھے کیونکہ ایک خلیفہ کے لیے کم از کم امور شرعیہ کا عالم ہونا ضروری ہے۔

خلفاء بنی عباس میں سب سے زیادہ عالم مامون الرشید تھا۔ یہ شریعت، لغت، نجوم، فلسفہ اور منطق خوب جانتا تھا۔ اس کے مقابل خلفاء اندلس میں حکم بن ناصر متوفی ۳۶۶ھ بہت بڑا عالم تھا اور دوسرا حاکم بامراللہ فاطمی والی مصر تھا جس کی وفات ۴۱۱ھ میں ہوئی۔ حکم بن ناصر عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ہی کتابیں جمع کرنے کا بے حد شائق تھا۔ حاکم بامراللہ علم نجوم کا ماہر تھا۔ اس نے قاہرہ میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی۔ عبدالرحمٰن اوسط والی اندلس بھی بڑا فاضل شخص تھا جس نے ۲۳۸ھ میں وفات پائی۔ اسی کے ذریعہ اندلس میں پہنچا، ورنہ وہاں کوئی اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

(جرجی زیدان)

چونکہ خلفاء خود عالم ہوتے تھے اس لیے تلاش کر کے علماء کو بلواتے تھے۔ اس کے علاوہ شعر و ادب میں خلفاء کے مختلف ذوق تھے۔ سفاح عرب کے مفاخرات و شاعری کے پرانے قصے بہت پسند کرتا تھا۔ (المسعودی ص۱۵۹ ج۲)

ہادی کی مجلس میں شعراء و ادباء کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ابن المعتز پہلا حکمران ہے جس نے بدیع میں ایک کتاب لکھی۔ (ابن خلکان ص۲۵۸ ج۱)

ابراہیم بن مہدی بہت بڑا ادیب تھا اور شاعر بھی۔ ایسے ہی صمدان، حلب اور اندلس کے امراء و رؤسا بھی تھے۔ خلفاء، امراء، رؤساء حکومت کی ان علمی دلچسپیوں اور علماء کی ان قدر دانیوں نے عوام کے اندر حصولِ علم کا بے پناہ جوش پیدا کر دیا۔ مسلمان مذہبی علوم کے پہلے ہی شائق تھے اور ضروری خیال کر کے حاصل کرتے تھے۔ اب وہ علوم دنیا کے بھی متوالے بن گئے۔ چنانچہ اس زمانہ میں تعلیم اس قدر عام تھی کہ بمشکل کوئی شخص جاہل و بے علم تھا حتیٰ کہ عورتیں اور مخنث بھی علم حاصل کرتے تھے اور ان کی تصنیفات بھی تھیں۔ (جرجی زیدان)

مصنّفین اور تصنیفات

ایسے علمی ماحول، ادبی ذوق اور مباحث علمیہ کی فراوانی میں اگر مصنّفین اور تصنیفات کی تعداد زیادہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ سلاطین، امراء، وزراء، اغنیاء اور فقراء جن میں عرب، فارس، روم، سریان، ہنود، ترک، دیلم اور قبط سب ہی شامل ہیں اس طرف متوجہ ہوگئے۔ وزراء، امراء، سلاطین و خلفاء کی پیروی میں مصنفوں کو نذرانے دے دے کر اپنے نام سے کتابیں تصنیف کراتے تھے۔ ان تصنیفات میں ہر قسم کے علوم کی کتابیں ہیں۔ انہوں نے علوم کی اتنی شاخیں نکالیں کہ اس وقت ان کی تعداد پانچ سو سے متجاوز ہوگئی اور بعض ایسے علوم ایجاد کیے جو اسلام سے قبل نہ تھے، جیسے علم الاقتصاد، سیاسیات، فلسفہ اور تاریخ۔ ان کی تصنیفات کی صحیح تعداد معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے، بہر حال! کشف الظنون اور کتاب الفہرست دیکھنے سے ایک معمولی سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لاکھوں سے بھی زیادہ ہوں گی۔

اسلامی مدارس

تحصیل علم کو اسلام نے جو اہمیت دی ہے اس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ اسلام نے علم کو روشنی اور جہالت کو تاریکی قرار دیا اور اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ لیکن ابتداءً مسلمانوں کے جملہ علوم کا مرکز قرآن کریم تھا اور اس کی تعلیم حاصل کرنا ان پر مذہباً ضروری اور لازمی تھا کیونکہ قرآن کلام الٰہی ہے اور صحیفہ آسمانی ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی رہنمائی کی گئی ہے۔ اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ وہ چبوترہ تھا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حجرۂ مبارکہ کے سامنے بنا ہوا تھا اور آج بھی موجود ہے اور اس مدرسہ کے اولین طلبہ صحابہ کرام تھے۔ اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ فقہ، تفسیر، حدیث، اصول فقہ، اصول حدیث، اسماء الرجال، ادب، لغت وغیرہا صدہا علوم مرتب ہوئے۔ ان سب کی بنیاد قرآن پاک تھا اور اس کی تعلیم فرض تھی۔ اس لیے ہر شخص ذوق و شوق کے ساتھ یہ علوم حاصل کرتا تھا۔ اس وقت کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جس کو جاہل کہا جا سکے۔ مسلمانوں کے مدارس مساجد میں ہوتے تھے اور ہر جامع مسجد میں ایک مدرسہ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

یہ فخر بھی صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے تعلیم کو اس درجہ عام کیا کہ دُور دراز گاؤں کی رہنے والی ایک دہقانی کسان کی عورت بھی زیورِ علم سے آراستہ ہوتی تھی۔ اس ترقی یافتہ دور میں (بقول مغربیوں کے) آج تک علم کی شعاعیں وہاں تک نہ پہنچ سکیں جہاں تک اسلام نے اپنے دورِ عروج میں پہنچادی تھیں۔ تعلیم سے نفس میں جو پاکیزگی، نفاست، لطافت، تہذیب و شرافت، ذکاوت و حذاقت اور فہم و شعور پیدا ہوتا ہے وہ سب قرآن پاک کی تعلیم سے حاصل ہو جاتا ہے۔ جب مسلمان ان علوم میں کامل ہوگئے تو انھوں نے علوم دنیا کی طرف توجہ کی اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے تراجم کرائے۔ ان زبانوں کے علماء و ماہرین کی بڑی قدر کی اور کثیر زر و مال ان پر خرچ کیا اور اس طرح تمام دنیا کے علوم عربی زبان میں منتقل کر لیے اور ان کی نشر و اشاعت اور

حصول کے لیے پھر باقاعدہ مدارس قائم کر دیئے۔ سب سے پہلا مدرسہ مامون نے خراسان میں بنایا۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹش آرٹس المامون)

اس وقت مامون خراسان کا والی تھا۔ ابن خدرک متوفی ۴۰۲ھ نے نیشاپور میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ (ابن خلکان ص ۴۸۲ ج ۱)

مدرسہ سعدیہ سلطان محمد کے بھائی نصر نے قائم کیا۔ یہ تمام مدارس بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ سے قبل قائم کیے گئے۔ نظام الملک نے خود بھی مدرسہ نظامیہ بغداد سے قبل نیشاپور میں زمانہ الپ ارسلان میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

(ابن خلکان ص ۲۸۷ ج ۱)

سب سے زیادہ مشہور مدرسہ قاہرہ کا جامع ازہر ہے۔ ۳۱۰ھ میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں جمیع علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ترکستان، فارس، ہند، یمن، شام اور اندلس وغیرہ جملہ ممالک اسلامیہ کے طلباء یہاں آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ فلسفہ و منطق اور طب کی تعلیم بھی اس مدرسہ میں ہوتی تھی۔ میر سید شریف اسی مدرسہ کے طالب علم تھے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد بھی ایک عظیم الشان دار العلوم اور جامعہ تھا۔ اس میں مشاہیر علماء نے تعلیم پائی۔ یہاں کے تعلیم یافتہ علماء کے حقوق حکومت بھی تسلیم کرتی تھی۔ اس جامعہ کے سب سے پہلے پرنسپل ابو اسحٰق شیرازی تھے جو امام غزالی کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ان کے بعد اس جامعہ کے پرنسپل امام ابو نصر، پھر ابو القاسم، بعد ازاں ابو حامد غزالی سہروردی اور کمال الدین وغیرہ اس کے پرنسپل ہوئے جو علم کے اقطاب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ نظام الملک ۴۸۵ھ میں مقتول ہوئے۔ ان کی تقلید میں بہت سے مدارس مصر، شام، فارس، دیلم اور اندلس وغیرہا میں بنائے گئے۔ اس کے علاوہ اساتذہ حضرات اپنے اپنے مکانوں اور قیام گاہوں پر بھی حلقہ ہائے درس قائم رکھتے تھے۔ اندلس، قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ و غرناطہ وغیرہا میں بھی بڑی بڑی درسگاہیں تھیں۔

کتب خانے

کتب خانوں کا بھی مسلمانوں کو بڑا شوق تھا۔ مامون، شاپور بن اردشیر، وزیر بہاء الدولہ، ناصر خلیفہ عباسی، حکم بن ناصر اموی حکمران اندلس، حاکم بامر اللہ، نور الدین، صلاح الدین ایوبی ان سب نے بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے یہاں تک کہ ہلاکو خان تاتاری نے بھی مراغہ میں نصیر الدین طوسی کے لیے ایک کتب خانہ قائم کیا جس میں چار لاکھ کتابیں بغداد و شام کے کتب خانوں سے لُوٹ کر بھر دیں۔ ان کے علاوہ امراء و عوام کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اور ہر ایک کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہوتا تھا۔ سلاطین و امراء کے ان کتب خانوں میں تیس تیس لاکھ کتابوں کی تعداد تھی۔ بقول جرجی زیدان مسلمانوں کے کتب خانوں میں کتابوں کا شمار ملیون میں تھا لیکن ان کا اکثر حصہ برباد ہو گیا۔ مشہور اسلامی کتب خانوں کی ایک مختصر فہرست یہ ہے:

(۱) کتب خانہ "بیت الحکمہ"...... یہ شہر بغداد میں تھا۔ اس کو مامون الرشید نے قائم کیا تھا۔ تعداد کتب دس لاکھ۔

(۲) "سابور"...... اس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار تھی۔

(۳) "الحکم"...... یہ کتب خانہ شہر قرطبہ میں تھا۔ اس کی کتابوں کا شمار چار لاکھ تھا۔

(۴) "خزائن القصور"...... یہ شہر قاہرہ میں تھا اور اس میں کتابوں کی تعداد دس لاکھ تھی۔

(۵) "دار الحکمہ"...... اس میں کتابوں کا شمار ایک لاکھ تھا۔

(۶) "کتب خانہ طرابلس شام"...... یہ فاطمیوں کا قائم کردہ تھا اور اس میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔

(۷) "مراغہ"...... یہ ہلاکو کا قائم کردہ تھا۔ اس کی کتابوں کی تعداد چار لاکھ تھی۔

یہ ہیں مسلمانوں کی علمی خدمات اور ترقیاں اور دنیا کو سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی تعلیم، لیکن اب ہم اقبال کے اس مصرع کا مصداق ہیں ۔

"تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو"

بیا اے چشمِ حیرت پیر کنعاں را تماشہ کن
کہ نُور دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اختتامیہ

الحمدللہ! کتاب "خلاصہ تاریخ عرب" اپنے اختتام کو پہنچی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اس کے پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچائے۔ آمین۔ اب ہم آخر میں دو امور پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

نمبرایک یہ کہ ہمارے انگریزی داں طبقہ کو، اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن، سیرت رسول پاک علیہ الصلوۃ والسلام، قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی امور کے بارے میں ہرگز ہرگز مغربی مصنفین، مفکرین اور مستشرقین کی تحقیقات اور تصنیفات پر قطعاً بھروسہ نہ کرنا چاہیے نہ بغیر تحقیق و تصدیق ان کی بات قبول کرنا چاہیے۔ یہ لوگ اسلام کے تعلق سے حد درجہ متعصب ہیں ہرگز حق و صداقت کی بات نہیں کہہ سکتے۔ اس انداز میں بات کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کا عقیدہ خراب ہو جائے اور ذہن اسلام کی طرف سے بگڑ جائے کیونکہ اسلام دشمنی ان کی گھٹی میں پڑی ہے، یہی حال یہود و ہنود کا بھی ہے۔ ہم ذیل میں وہ اقرار پیش کرتے ہیں جو ایک فرانسیسی محقق موسیو لیبان نے کیا ہے۔ نہ معلوم کس جذبہ کے تحت وہ یہ حقیقت بیان کر گئے۔ ایک مقام پر اپنی کتاب تمدن عرب ص ۵۲۲ پر وہ لکھتے ہیں: "فی الواقع ہماری رائے کی آزادی (اسلام اور مسلمانوں کے

بارے میں) اصلی نہیں ہے بلکہ ظاہری ہے اور بعض مسائل پر ہم ہرگز جس آزادی سے چاہتے ہیں غور نہیں کر سکتے۔" (ترجمہ سید علی جنٹس حیدر آباد)

آگے چل کر صفحہ ۵۲۳ پر لکھتے ہیں:

"وہ موروثی تعصب جو ہمیں اسلام اور پیروانِ اسلام کے خلاف ورثہ میں ملا ہے اور جمع ہوتا آرہا ہے اور وہ ہماری فطرت کا ایک جزو ہو گیا ہے، ہمارے یہ تعصبات اس قدر جبلی اور اسی قدر شدید ہیں اگرچہ بعض وقت وہ دبا کیوں نہ دیئے جائیں، جیسے یہودی تعصبات عیسائیوں سے۔" آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: "اس موروثی تعصب میں جو ہمیں اسلام کے برخلاف ہے اگر ہم اس دوسرے تعصب کو شریک کر لیں جسے ہماری کمبخت تعلیم نے سالہائے دراز سے ہمارے ذہن نشین کر دیا ہے کہ "کل قدیم علوم و ادب صرف یونان و روم سے منشعب ہوئے ہیں" تو بخوبی ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ تمدن یورپ کی تاریخ میں عربوں کے حصہ سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ بعض اشخاص کو اس خیال سے بہت شرم آتی ہے کہ یورپ کی وحشیانہ معاشرت سے نکلنے کے باعث عیسائی ایک کافر قوم تھی۔ یہ خیال اس قدر دردناک ہے اس سے انکار کرنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔" (موسیو لی بان تمدن عرب ص ۵۲۳)

دیکھا آپ نے ان کو اسلام اور مسلمانوں سے کس درجہ دشمنی، بغض و عداوت اور کس درجہ نفرت ہے کہ اسلام کے بارے میں وہ نہ صداقت قبول کر سکتے ہیں، نہ حق بات کہہ سکتے ہیں۔ نہ اس صداقت کو تسلیم کر سکتے ہیں وہ صرف اسلام ہے جس کی بدولت یورپ نے اپنی وحشیانہ معاشرت اور جہالت و ذلت سے نجات حاصل کی۔

دوسرا اس امر کا جواب دینا ہے کہ ان تمام علمی ترقیوں، نئی نئی ایجادات و انکشافات اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت، شرق و غرب میں ان کا تسلط اور ان کے تمدن کی برتری اس کے باوجود مسلمان مغلوب کیوں ہو گئے اور ان پر ایسے لوگوں نے غلبہ حاصل کر لیا جو ان سے ہر حالت میں کم تر تھے، خواہ وہ علم کا میدان ہو یا تجارت و زراعت کا، ایجاد و انکشافات کا معاملہ ہو یا صنعت و حرفت اور تعمیر کا ان تمام امور میں تفوق کے باوجود وہ اپنے مدمقابل نہایت ہی کم درجہ اور کم مرتبہ والی قوم سے مغلوب

ہو گئے اور ایسے مغلوب ہوئے کہ بعض جگہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جیسے اندلس میں ہوا۔ اس سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ محض علمی ترقیاں، تجارت و زراعت کی برتری اور صنعت و حرفت میں کمال ہی کسی قوم کے تسلط و حکمرانی کی بنیاد ہے نہ ضروری، اگر ایسا ہوتا تو ہرگز ہرگز تاتاری قوم ایک متمدن و منتظم اور تجربہ کار مسلم حکومت کو شکست فاش دے کر اسے پارہ پارہ کر کے اس پر قابض و مسلط نہ ہو سکتی تھی جبکہ پوری تاتاری قوم تہذیب و تمدن سے ناآشنا اور علم سے بے بہرہ جہالت کی تاریکیوں میں تھی۔ یہی صورت اندلس میں تھی کہ مسلم حکومت اپنی مدمقابل اندلسی قوم سے ہر حیثیت میں برتر تھی اور یورپ کے لوگ جہالت کے قعر مذلت میں تھے۔ مگر وہ ایک نہایت درجہ متمدن اور علمی جاہ و جلال والی حکومت پر غالب آئے مسلم حکومت کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان اندلس سے ایسا فنا ہوا کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، مسلمانوں کا علمی کمال اور بہترین تمدن و طرز معاشرت وغیرہ کچھ بھی مسلمانوں کے کام نہ آیا۔ اس سے یہ دعوی ثابت ہوتا ہے کہ ملک گیری اور ملک داری کی بنیادیں ہی کچھ اور ہیں، ضروری نہیں کہ اہلِ علم اور اصحابِ فضل و کمال میں وہ خوبیاں موجود ہوں جو ملک گیری اور ملک داری کے لئے ضروری و لازمی ہیں۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ جو قوم علم کی روشنی سے محروم ہوتی ہے دنیا میں اس کی کوئی عزت و وقعت، کوئی شرف و وقار نہیں لیکن یہ بھی تاریخی صداقت ہے کہ محض علم و فضل انسان کو حکومت و اقتدار اور غلبہ و تسلط حاصل کرنے کے اہل نہیں بناتا۔ جب تک اس میں ملک گیری اور ملک داری کے خصائص نہ ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اکبر اعظم کے نورتن اپنے اپنے علم و فن میں باکمال اور اپنے زمانہ میں منفرد تھے لیکن ان میں سے بادشاہ و حکمران کوئی نہ بن سکا، حکومت و بادشاہت ایک بے علم شخص اکبر کی تھی۔ جس کو مورخین نے 'مغل اعظم' کا خطاب دیا۔ لہٰذا ہمیں غور کرنا چاہیے کہ جب مسلمانوں میں اہلِ علم و فن اور اصحابِ کمال کی کمی نہ تھی پھر بھی ان کا زوال کیوں ہوا؟ اسی جواب کی تفصیل سے یہ سوال بھی حل ہو جائے گا آج دنیا میں مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد اور اتنی تعداد میں مسلم حکومتوں اور اتنی اقتصادی اور معاشی استحکام

کے باوجود ہم کیوں محکوم و مغلوب ہیں؟......

جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ اپنے کسی کام میں اسباب و ذرائع کا محتاج نہیں اس کا معاملہ تو یہ ہے "بلاشبہ اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی چیز پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو فرمادیتا ہے کن۔ یعنی ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔" لیکن اس نے اپنی مصلحت سے نظام دنیا کو اسباب و علل کے ماتحت کیا ہوتا ہے جب تک سبب یا علت موجود نہ ہوگی مسبب اور معلول کا وجود نہ ہوگا۔

یہی حال ملک گیری اور ملک داری کا بھی ہے جب تک اس کے اسباب و علل و کو اختیار نہ کیا جائے گا، نہ ملک گیری حاصل ہوگی اور نہ ملک داری باقی رہ سکے گی۔ وہ اسباب و علل جو ملک گیری اور ملک داری کے لئے میری تحقیق میں آئے ہیں وہ میں عنقریب بیان کروں گا۔ پہلے تاریخی حقیقت بیان کردوں کہ دنیا میں اہلِ علم و اہلِ کمال اور اعلیٰ درجہ کے تجار و صنعت و حرفت والوں کی حکومت شاذ و نادر رہی ہے سوائے انبیاء کرام کے، جیسے حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف اور حضور پاک علیہم الصلوٰۃ والسلام اور خلفاء راشدین کے، ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی کہ کسی صاحب علم و فضل و کمال نے حکومت کی ہو، غور و فکر اور مطالعہ کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ملک گیری اور ملک داری کے لئے جو بنیادی اسباب ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) حکمران اور اس کے رفقاء اور حامیوں میں کامل اتحاد و خیر خواہی ہو یعنی قومی اتحاد و یک جہتی۔

(۲) یہ کہ قوم کا ہر فرد بشر اپنے حکمران، اپنے امیر و بادشاہ کا اطاعت گزار اور اس کے ہر حکم پر دل کی گہرائیوں سے عمل کرنے والا ہو۔

(۳) یہ کہ وہ امیر و حکمران اس قدر قوت، غلبہ اور دبدبہ رکھتا ہو کہ اندرونی بغاوتوں کو دبا سکے اور بیرونی حملہ آور کا منہ توڑ جواب دے سکے۔

(۴) بادشاہ و والئی امر یا حکمران میں حکومت کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ہو۔ انتظامی و سیاسی بصیرت رکھتا ہو۔

یہی چار چیزیں تھیں جب مسلم حکومتوں میں ان کا فقدان ہو گیا تو وہ معمولی مخالف

قوتوں سے بھی مغلوب ہو گئے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان دنیا میں اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مغلوب و مقہور ہیں اور دنیا میں اتنی بڑی تعداد میں مسلم حکومتیں ہونے کے باوجود نہ ان کی قوت، نہ اقتدار، نہ تسلط، نہ غلبہ، وہ سب اپنے وجود و بقا میں غیروں کی حمایت و مدد کے محتاج، مخالف اور دشمن جس مسلم حکومت کو چاہتا ہے اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنالیتا ہے اور کسی کو لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی بلکہ دوسری مسلم حکومتیں اپنے بغض و حسد سے اپنا دلی اطمینان محسوس کرتی ہیں جو ان کا نہایت درجہ احمقانہ اور غیر دور اندیشانہ فعل ہے۔ وہ اپنے دشمن و بدخواہ اور ظالم جابر کے سامنے کتنی ذلت و خواری سے دست بستہ رہتے ہیں اور اپنی اور اپنے ملک کی ساری دولت اپنے قبضہ و اختیار سے نکال کر اپنے دشمن کے اختیار و تصرف میں دیئے ہوئے ہیں اور اسی کے اشارۂ چشم و ابرو پر ان کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ہی دشمنوں کے اپنی بدترین حماقت سے بدترین اور ذلیل تر غلام بن گئے ہیں۔

قسم ہے اس ذات کی جو اس کائنات کا خالق ہے اور اس نظام کائنات کو چلا رہا ہے مسلمان قوم اور مسلم حکمران ہرگز ہرگز اس غلامی اور ذلت سے نہیں نکل سکتے جب تک وہ مل کر اپنا ایک امیر و حکمران اور اپنے میں سے ایک اولی الامر نہ چن لیں گے اور اس کی اطاعت نہ کریں گے اور اپنے اندر اتحاد و اتفاق اور باہمی خیر خواہی پیدا نہ کریں گے جس کا حکم قرآن کریم میں دیا گیا ہے۔

رب تعالیٰ فرماتا ہے: "ولا تنازعوا...... الایہ" (الانفال: ۴۶) (ترجمہ) "آپس میں جھگڑا نہ کرو (پھوٹ نہ ڈالو) ورنہ تم پھسل جاؤ گے، کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

دوسری جگہ فرمایا: "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو یعنی سب مل کر متحد ہو جاؤ۔" (آل عمران: ۱۰۳)

اور اطاعت امیر کے لئے فرمایا: "اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو اپنے اولی الامر کی۔"

مسلم قوم میں اگر یہ خصوصیتیں پیدا ہو جائیں یعنی ان کی صفوں میں کامل اتحاد اور

امیر کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یقیناً ان کی متاع گم گشتہ انہیں پھر حاصل ہو جائے گی، ان کا بول بالا ہو جائے گا اور پھر انہیں کوئی ٹیڑھی نگاہ سے نہ دیکھ سکے گا۔ ہمارے دشمنوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے اور وہ برابر اس کوشش میں ہیں اور ایسی تدابیر اختیار کر رہے ہیں کہ مسلم قوم کا یہ شعور بیدار نہ ہونے پائے...... اللہ تعالیٰ ہمارے اندر اتحاد و اتفاق پیدا فرمائے اور ہمیں اپنا اولی امر منتخب کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کی توفیق دے، آمین۔

مضبوط حکومت بنے گی تو بین الاقوامی دنیا میں عزت و وقار کی راہیں کھلیں گی اور علمی ترقیوں سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ ونور عرشہ سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العلمین۔

راقم الحروف
الفقیر ظہیر احمد زیدی غفرلہ
دودھ پور، علی گڑھ
۲۰ ستمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ

مآخذ و مراجع

ان کتابوں کے نام جن سے براہ راست یا بالواسطہ اس تالیف کی ترتیب میں مدد لی گئی:

(۱) مقدمہ ابن خلدون۔
(۲) تمدن عرب موسیولی بان (مترجمہ جسٹس سید علی)
(۳) تمدن ہند موسیولی بان (مترجمہ سید علی)
(۴) تمدن عرب جوزف ہیل۔
(۵) فقہ الاسلام حسین احمد الخطیب المصری۔
(۶) تاریخ ادب العربی۔
(۷) علوم عرب (جرجی زیدان)
(۸) تاریخ تمدن اسلامی (جرجی زیدان)
(۹) تاریخ لغۃ العربیہ (احمد حسن زیات)
(۱۰) وفیات الاعیان (ابن خلکان)
(۱۱) ورلڈ سولائزیشن (جسٹس امیر علی)
(۱۲) خلافت راشدہ (محمد علی)
(۱۳) سیرت خیر البشر علیہ السلام (محمد علی)

(۱۴) تاریخ اسلام (اکبر شاہ نجیب آبادی)
(۱۵) سیرت المصطفیٰ علیہ السلام (عبدالمصطفیٰ اعظمی)
(۱۶) تاریخ حبیب اللہ (صوفی عنایت احمد کاکوروی)
(۱۷) تاریخ الخلفاء (علامہ جلال الدین سیوطی)
(۱۸) کتاب الفہرست (ابن ندیم)
(۱۹) کشف الظنون (حاجی خلیفہ)
(۲۰) مشکوٰۃ شریف (خطیب بغدادی)
(۲۱) بخاری شریف (محمد بن اسمٰعیل بخاری)
(۲۲) مسلم شریف (مسلم بن الحجاج قشیری)
(۲۳) لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سر ولیم میورے۔
(۲۴) عقد الفرید۔
(۲۵) تفضیل العرب علی العجم (ابن قتیبہ)
(۲۶) البیان والتبیین (جاحظ)

الشفاء

بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اردو ترجمہ بنام

دربارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق و آداب (مکمل)

تصنیف: امام المحدثین قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ

ترجمہ: مولانا علامہ سید احمد علی شاہ بٹالوی سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (الآیۃ)

جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے

محتسب خم شکست، من سر اُو

سِنّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحُ قِصَاص

محتسب نے گھڑا توڑا، میں نے اس کا سر، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے زخم

اہلِ سنت وجماعت اور دیوبندی مکتبہ فکر کے اختلافات اور
امام احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ پر کئے جانے والے اعتراضات کا تحقیقی جائزہ

فقیہ الہند علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمہ اللہ تعالیٰ
شارح بخاری و صدر شعبہ افتاء جامعہ اشرفیہ مبارکپور ہند

ناشر
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء

محبوبِ الٰہی رحمۃ اللہ تعالیٰ

حالاتِ زندگی، اخلاق و کردار، کشف و کرامات
تعلیمات اور نامور خلفاء کا تذکرہ

تالیف
ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی مدظلہ العالی
ایم اے پی ایچ ڈی
پرنسپل شمس العلوم، گھوسی انڈیا

ناشر
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

Marfat.com

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اسے سمجھنے کیلئے شرک کا سمجھنا ضروری ہے جو توحید کے مقابل ہے یہی اس کتاب کا موضوع ہے، نبی اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمان یاد رہے کہ: ہمیں یہ خوف نہیں کہ تم ہمارے بعد شرک میں مبتلا ہوگے (بخاری شریف)

مؤلف

مولانا علامہ محمد یحییٰ انصاری اشرفی مدظلہ

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

فرید بُک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اُردو بازار لاہور
Email: info@faridbookstall.com
Web Site: www.faridbookstall.com